تہذیبِ فکر

ڈاکٹر عمر حیات

Marfat.com

تہذیبِ فکر

ڈاکٹر عمر حیات

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

Marfat.com

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ

292-04
۱۱۰۸۳۲

اشاعت : 2012ء
کتاب : تہذیبِ فکر
مصنف : ڈاکٹر عمر حیات
ناشر : محمد عابد
تزئین : عبدالحفیظ
قیمت : 300روپے
مطبع : B.P.H پرنٹر، لاہور

Tahzeeb-e-Fikr

by

Dr. Umar Hayyat

Edition - 2012

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد
Cell: 0300-7980300
E-mail:misalkitabghar@gmail.com

Marfat.com

نوجواں مسلم کے نام!

جس کی تہذیبِ فکر

صبحِ روشن کی دلیل ہے

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

- ❑ نُطقِ اِنسانی کی معراج — ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی — 11
- ❑ حَرْفُ الْحُرُوْف — مصنف — 13
- ❑ چراغ جلتا رہے! — ڈاکٹر عبدالستار — 17

- ○ اِنقلاب آفریں احساس — 20
- ○ امن کا ضامن معاہدہ — 22
- ○ اِتحاد کا راز — 25
- ○ علم کا کرشمہ — 28
- ○ قوم کا سردار! قوم کا خادم — 31
- ○ بے مثل صبر و ثبات — 33
- ○ فطرت جھنجھوڑتی ہے! — 36
- ○ جب خوفِ خدا نہ رہے! — 38
- ○ آغاز و انجام — لازم و ملزوم — 41
- ○ جامع العبادات رکنِ دین — 43
- ○ ہر بات سبق آموز ہے — 46
- ○ ماضی فراموشی — 48

Marfat.com

- ہے کہیں اِس کی مثال! 50
- نشاناتِ عبرت 52
- ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا! 55
- اے مکہ! تو مجھے بہت عزیز ہے! 58
- ماحول کا اثر 60
- جاہلوں سے اعراض 62
- فیصلہ کن ہدایت 64
- نماز کے دوران فون کی گھنٹی 66
- جو رہی خودی تو شاہی! 69
- دامنِ اسلام کی وسعت 71
- زبان اور ہاتھ 73
- خواب کی تعبیر 76
- آں کتابِ زندہ! 79
- اِصلاحِ اَخلاق 82
- نجات کا راز 84
- حقِ زندگی اور دہشت گردی 86
- ایک دِل خراش حقیقت 89
- کسی چراغ کی لَو سے کسی کا گھر نہ جلے! 91
- حیاتِ اُخروی فسانہ نہیں! 93
- روشنی کا سفر 95
- مادیت زدہ خون کا رِشتہ 97
- جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا! 99

Marfat.com

○ بے قصور کو ظالم کے حوالے کرنا بھی ظلم ہے	101
○ قانون ہو تو سب کے لیے!	103
○ قُولوا لِلنَّاسِ حُسْنًا	105
○ آزادی کیا ہے؟	107
○ ڈوبتے کو سہارا چاہیے!	109
○ اجتماعی اخلاقی قدرِ مشترک	111
○ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ!	113
○ طوطے کا پیغام	116
○ دن منانے کا رواج	119
○ گداگری کا روگ	121
○ معجزے کے انتظار میں کہیں دیر نہ ہو جائے!	123
○ اِحسانِ عظیم کی ناقدری کا نتیجہ	125
○ درسِ عبرت	128
○ حرمتِ کعبہ	130
○ سچائی کی طاقت	132
○ وقت کسی کا منتظر نہیں!	134
○ کتاب دوستی	136
○ آؤ درخت لگائیں	138
○ رازی کا راز	140
○ کھانے پینے کے آداب	142
○ جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو؟	145
○ دین خواہشات کو کچلتا نہیں	147

Marfat.com

○ دورِ جاہلیت کے تازہ شاخسانے 149
○ نرم رویہ کمزوری نہیں! 151
○ تکیۂ کلام 153
○ سنی سنائی بات کی تشہیر 155
○ اقبال بھی یورپ گئے تھے! 157
○ مؤدبانہ گزارش ہے! 159
○ اسلامی زندگی کا جزوِ لاینفک 161
○ جیسا کرنا ویسا بھرنا 163
○ قدیم عربوں کے بارے میں ایک تاثر 165
○ مثال کی ضرورت 168
○ شکر اور ایمان لازم وملزوم ہیں 170
○ فطری معیارِ فضیلت 173
○ عبادت اور مذہب کا دائرۂ کار 175
○ دوزخ اور جنت 178
○ فطرت کی دعوتِ فکر 181
○ اولاد کے قصور جذبہ ممتا میں جذب ہو جاتے ہیں! 183
○ فاتح اندلس 185
○ بچے تو بچے ہیں! 188
○ بانیٔ پاکستان کا مطلوبہ پاکستان 190

Marfat.com

نُطقِ اِنسانی کی معراج

قوتِ کلام انسان کا وہ جوہر ہے جو اسے باقی تمام مخلوق سے سرفراز کرتا ہے۔ 'عَلَّمَہُ الْبَیَان' عطا بھی ہے اور شرف بھی، یہ تو انسان کا لزوم ہے کہ وہ اس شرف کی حفاظت کرے۔ اس سے نقلِ افکار کا اعزاز بھی حاصل ہوتا ہے اور ترابط بین الناس کی سہولت بھی۔ انسان کے دل و دماغ میں جنم لینے والے جذبے اور خیالات ملفوظ نہیں ہوتے، اسے معاشرتی حس حرف وصوت کی صورت عطا کرتی ہے۔ خیال کی صورت گری کلمات میں ہوتی ہے مگر اس کی یہ تحویل ایک کامیاب صلاحیت کی متقاضی ہے۔ صوت جب حرف آشنا ہوتی ہے تو ایک شعوری سفر طے کرتی ہے، پھر حروف کے مرکب تیار ہوتے ہیں جو صلاحیتِ نطق کا پیش خیمہ بنتے ہیں، یہ صلاحیت مختلف اعضاءِ نطق کے ذریعے خارج کا رُخ کرتی ہے اور فضا میں ایک نغمگی کا اظہار ہوتا ہے جو قاری یا سامع کی سماعتوں سے ٹکرا کر اپنا وجود منواتی ہے اور پھر حرف سے صوت اور صوت سے خیال کا رُوپ دھارتی ہے۔ یوں متکلم کا خیال سامع کا خیال بن جاتا ہے اور یہی نقلِ افکار کا سارا مرحلہ ہے۔ ایک اچھا خیال ان مراحل سے بخیر وخوبی گزرے اور پھر عمدہ خیال کے طور پر راسخ ہو جائے تو یہی نطقِ انسانی کی معراج ہے۔

مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ خیال سے خیال کا سفر اکثر ناقص رہتا ہے جس سے ایصالِ خیال کو سلامتی نصیب نہیں ہوتی۔ وہی قادرالکلام ہے جس کا خیال محفوظ صورت میں منتقل ہو اور اگر ایسی صلاحیت نصیب ہو جائے تو تکلم اور سماعت کا حسن وجود میں آتا ہے، اس کامیاب سفر کے لیے طویل گفتگو بھی درکار نہیں ہوتی، تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ لمبے لمبے خطبے اور طویل سے طویل مضمون آرائیاں بھی بسا اوقات لاحاصل ہوتی ہیں اور بعض اوقات ایک جملہ بلکہ ایک حرف

Marfat.com

بھی تاثر پذیری کا وہ ذریعہ بنتا ہے کہ لوحِ قلب و ذہن اسے کسی صورت مٹا نہیں سکتی۔

ریڈیو پاکستان کا ''روشنی'' پروگرام اسی مختصر مگر جامع نقلِ افکار کا ذریعہ ہے، ایک خیال جو ایک رُخ کا عکاس ہوتا ہے، چند ضروری کلمات کے جلو میں سامعین تک پہنچتا ہے کہ اثر آفرینی کا اِک جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ یہ لفظوں کی کفایت شعاری کا مظہر پروگرام سماعتوں سے یوں ٹکراتا ہے کہ فکرِ راست کے تار ہلا دیتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عمر حیات بھی ایسے مختصر نویسوں میں سے ہیں جن کے ہاں کلمات کا ضیاع نہیں ہوتا۔ ایک مرکزی نقطہ جو ضروری کلمات کا لباس پہن کر فضاؤں میں تیرتا ہے کہ سامعین کی چاہتوں کا اس طرح اسیر ہوتا ہے کہ نہاں خانۂ دِل میں قرار پکڑ لیتا ہے، مختصر جملے، مناسب الفاظ مگر واضح مفہوم، یہ ان ادائیگیوں کے اہداف ہیں جو عمر حیات کے بیان میں اپنے دیدہ زیب مناظر کے ساتھ طلوع ہوتے ہیں۔ عمر حیات کو مختصر مگر برمحل بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ لفظوں کی فضول خرچی سے محفوظ رہ کر بھی اپنا مافی الضمیر پوری قوت سے بیان کر سکتا ہے۔ سامع کے گوشِ حق نیوش ان کلمات سے غور و فکر میں ڈوبنے لگتے ہیں اور مقصود و مدعا کو پالینے کا حوصلہ پانے لگتے ہیں۔ اس طرح نیک خیال، نیک انجام کو پہنچتا ہے۔

ڈاکٹر عمر حیات کا دورانیہ کلام محدود ہے، موضوعِ گفتگو بھی ایک مفرد خیال ہے اس لیے نہ یہاں کلمات کی قطاریں طویل ہیں، نہ معانی کی بوقلمونی سدِ راہ ہے، ایک نصیحت آمیز خیال ہے جو منتخب الفاظ کے سایوں میں آمادۂ سفر ہے، یقیناً یہ ایک کامیاب راہ گیر ہے جس کی منزل متعین ہے اور وہ الفاظ کی فضول خرچی کا متحمل بھی نہیں ہے، ان نثر پاروں کو پڑھتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ کتنا بڑا ہدف کس قدر آسانی سے حاصل کر لیا گیا ہے۔ یہی ڈاکٹر عمر حیات کی کامیابی کا اوّلین حوالہ ہے مجھے یقین ہے کہ جب قاری ان قطعاتِ نثر کو پڑھے گا تو خیالات کی ثروت مندی سے فیض یاب ہو گا اور اُس کے رویّوں کو صالحیت کی تحریک ملے گی۔

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکزِ تحقیق، فیصل آباد

Marfat.com

حَرفُ الحروف

تمام تر حمد و ثنا، تعریف و توصیف، تحسین و آفرین اور عبادت و بندگی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے جو ہر لحاظ و ہر انداز سے بے مثال، باکمال اور لازوال ہے ــــــ اور لاکھوں درود و سلام حضور سیّدِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر کہ جس پر اللہ نے اپنے دین کی تکمیل کی اور اسے قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کے لیے بہترین نمونۂ فکر و عمل (اُسوۂ حسنہ) قرار دیا۔

دینِ فطرت صرف اسلام ہے جو اللہ کا دین ہے۔ فکری و عملی ہر لحاظ سے ثابت شدہ بات ہے کہ دینِ فطرت ہی کی ہر ہر بات مبنی برحق و صداقت اور فطرت سے قریب تر ہے۔ یہی وہ ضابطۂ ہدایت ہے جس میں عالمِ انسانیت کی حقیقی فلاح کا راز مضمر ہے۔ اِس دین کا تعارف اللہ تبارک و تعالیٰ کے منتخب انسانوں یعنی انبیاء و رُسل علیہم السلام نے پیش کیا اور یہ سلسلۂ ہدایت تاریخِ انسانی کے ہر دور میں جاری رہا یہاں تک کہ ابوالبشر حضرت آدمؑ سے شروع ہونے والا رُشد و ہدایت کا الہامی سلسلہ حضور سیّدِ عالم محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر مکمل کر دیا گیا۔

جسے اشرف المخلوقات قرار دیا جائے وہ صرف انسان ہے۔ تخلیقِ انسانی ہی کے حوالے سے قرآنِ حکیم میں 'احسنِ تقویم' کی ترکیب اِستعمال ہوئی اور اسی کے بارے میں تکریم کا خصوصی تذکرہ ہوا۔ خالقِ کائنات کی طرف سے ہدایت کا آغاز، اس کا مختلف مراحل سے گزرنا اور بعثتِ محمدی ﷺ کی شکل میں نقطۂ عروج کو پہنچنا صرف انسان کے لیے ہے۔ ضروری ہے کہ ہر دور کا انسان اِس ہدایت کی روشنی میں تسلیم و رضا کا پیکر بنے، اس کا ظاہر و باطن ہم آہنگ ہو جائے اور یہ حقِ بندگی ادا کرے کہ یہی اس کا مقصدِ حیات ہے۔

ظاہر و باطن کی ہم آہنگی سے مراد یہ ہے کہ انسان کا تزکیۂ نفس ہو، وہ شعوری طور پر

Marfat.com

ایمان لائے اور اس کے ظاہری اعضاء و جوارح سے ایمان کے عملی تقاضوں کا اظہار ہو۔ دینِ فطرت انسان کی تعمیر سیرت و کردار کا آغاز تزکیۂ نفس سے کرتا ہے جسے تہذیبِ فکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اصلاح کردار کی اساس ہے جس کا مضبوط سے مضبوط تر ہونا بنیادی تقاضائے فطرت ہے۔ انبیائے کرامؑ نے سب سے پہلے اور خاص اہتمام کے ساتھ تہذیبِ فکر پر توجہ مرکوز کی کیونکہ اگر انسان کا زاویۂ فکر درست ہو جائے تو عمل کی اصلاح کے اِمکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔

اِسلام ہر خاص و عام کی فلاح کا علمبردار ہے۔ یہ سراسر خیر خواہی پر مبنی دِین ہے۔ اِس کی دعوت ہے کہ نورِ ہدایت کو آگے سے آگے پہنچایا جائے۔ ابلاغِ ہدایت کا یہ نبوی فریضہ خصوصیت کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کے اُس طبقے پر عائد کیا گیا جو شعور و ادراک اور فہم دین میں ممتاز حیثیت رکھتا ہو ۔۔۔ ریڈیو پاکستان، اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وہ قومی نشریاتی ادارہ ہے جو وطنِ عزیز کے قیام ہی سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ ایک اسلامی نظریاتی ملک کا قومی اِدارہ ہونے کے ناتے ابلاغِ دِین کی ذمہ داری اِس پر بھی عائد ہوتی تھی۔ اِسی احساسِ فرض کے تحت ریڈیو پاکستان کی نشریات میں اسلامی تعلیمات پر مبنی پروگراموں کو شروع ہی سے باقاعدہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ اِس سلسلے میں پروگرام ''حی علی الفلاح'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مشیتِ ایزدی تھی کہ ایک کم مایہ اور ناتواں شخص اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے زیورِ نایاب سے آراستہ ہوتا اور شعبۂ تدریس و تحقیق میں خدمات انجام دیتا نیز اس سے ریڈیو پاکستان کے پلیٹ فارم سے بھی ہدایت کے ابلاغ کا کام لیا جاتا ۔۔۔ میری تدریسی اور نشریاتی زندگی کا باقاعدہ آغاز کم و بیش ربع صدی قبل ساتھ ساتھ ہوا تھا۔ اگرچہ تعلیمی ادارے ابلاغ کے مراکز ہیں لیکن اگر کسی کو ایسا ذریعۂ ابلاغ بھی میسر آ جائے جہاں ابلاغیات کی شرائط پر پورا اُترنا ہی اصل معیار مانا جاتا ہو تو اُس کی ابلاغی صلاحیت یقیناً کئی گنا مضبوط ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو پاکستان ایک مکتبۂ فکر ہے جس کا مزاج قومی ہے، ایک تربیت گاہ ہے جہاں تلفظ، لب و لہجہ اور وقف و تاکید (Stress & Pause) کی تربیت کے ساتھ ساتھ ''وقولو اللناس حسنا'' کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ایک درس گاہ ہے جہاں سے گھر بیٹھے عوام الناس کو مختلف طرح کے سبق فراہم کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے ساتھ وابستگی میرے لیے بہت خوش آئند اور باعثِ فخر ثابت ہوئی۔ اِس کی بدولت مجھے حُسنِ تلفظ، حُسنِ تخاطب، حُسنِ رواداری، خود اعتمادی اور اسلامی نظریاتی حوالے

Marfat.com

سے منفرد پہچان ملی۔

بحمد اللہ! یہ اعزاز بھی نصیب ہوا کہ میں نیشنل ٹیلنٹ ایوارڈ کے لیے ایک سے زیادہ دفعہ نامزد ہوا۔ البتہ Best Performance ایوارڈ پی بی سی کے فیصل آباد یونٹ کی طرف سے عطا کیا گیا۔ سامعینِ کرام کی طرف سے بذریعہ خطوط اور ٹیلی فون پذیرائی اور حوصلہ افزائی نے بھی میرے اندر خوش کن اور حوصلہ افزا احساس اُجاگر کیا۔ میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ میں اپنے کام سے پہچانا جاؤں جو پوری ہوئی ہے۔

اداروں کی کامیابی افراد کی حُسنِ کارکردگی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ پی بی سی کی تاریخ ایسی بہت سی نابغہ روزگار شخصیات سے عبارت ہے جنھوں نے نشریات و ابلاغیات کی حقیقی رُوح کو سمجھا اور نت نئے تقاضوں اور چیلنجوں سے عہدہ برآ ہو کر شان دار روایات قائم کیں ــــ ان جوہرشناسوں میں سے ایک معتبر نام جناب عبدالستار کا ہے جنھوں نے پروگرام پروڈیوسر سے لے کر ڈائریکٹر پروگرامز تک ترقی کی منازل طے کیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے براڈ کاسٹنگ کی ابجد اُن سے سیکھی اور انھوں نے مجھے اس قابل جانا کہ میں ان کی زیرِ نگرانی ''الہدیٰ'' کی میزبانی کے فرائض انجام دوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب پروگراموں کے میزبانوں کا انتخاب کٹھن تربیتی مراحل میں سے گزر کر عمل میں آتا تھا۔ میرے لیے باعثِ افتخار بات ہے کہ انھوں نے میری کارکردگی پر مُہرِ اطمینان ثبت کی اور آنے والے وقتوں میں میرے کام کو اور بھی سراہا جاتا رہا۔ ''الہدیٰ'' کی میزبانی تا حال میرا اعزاز ہے ــــ اس کے علاوہ خصوصی پروگراموں میں ماہِ مبارک رمضان کی نشریات ہوں، جشنِ نزولِ قرآن اور ماہِ مبارک ربیع الاوّل کی مناسبت سے سیرت سیمینار ہوں یا خلفائے راشدینؓ کے حوالے سے خصوصی پروگرام، ان کی میزبانی کے لیے پی بی سی فیصل آباد کی نمائندگی کا شرف بھی مجھے ہی حاصل رہا ہے۔

محترم جناب عبدالستار کے ترغیب دلانے پر ہی میں نے ریڈیو پاکستان کے لیے ''روشنی'' کا اسکرپٹ لکھنا شروع کیا تھا جو تادمِ تحریر جاری ہے۔ ''تہذیبِ فکر'' کے عنوان سے کتابی شکل میں میری یہ کاوش انھی ''منتخب مسوداتِ روشنی'' پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی قیمتی تحریر کی شکل میں دُعا سے نوازا ہے کہ 'چراغ جلتا رہے!' آمین! حقیقت یہ ہے کہ میرے شکریے کے اوّلین حق دار جناب عبدالستار ہیں ــــ میں ریڈیو پاکستان کے اربابِ اختیار کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے

Marfat.com

اشاعتِ ہٰذا کی اجازت دی۔ اللہ کرے کہ اس کا مقصدِ اشاعت پورا ہو اور نشری تقاریر کی طرح اِسے بھی پذیرائی حاصل ہو۔

میں صمیمِ قلب سے ممنون ہوں استاذی المکرّم جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی کا کہ انھوں نے ''انسانی نطق کی معراج'' کے عنوان سے اپنی نوعیت کا نایاب اور لاجواب نمونۂ نگارش عطا کر کے مجھے اعتماد بخشا۔

میں اپنے دیگر اساتذہ کرام جناب پروفیسر ڈاکٹر ایس ایم شریف، پروفیسر چوہدری محمد صدیق، پروفیسر ڈاکٹر محمد نواز چوہدری، پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر، نیز معزز رفقاء و احباب پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس، پروفیسر ڈاکٹر خالد ظفر اللہ، پروفیسر ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم، پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر شاہد، پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد آغا، پروفیسر محترمہ طلعت صفدر اور پروفیسر معین الدین، ڈاکٹر محمد حامد رضا، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، پروفیسر وقار اصغر پیرو ز، جناب یاسر عرفات اعوان اور دیگر تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے نشری حوالے کی ہمیشہ قدر افزائی کی۔

پی بی سی کے حوالے سے میں شکر گزار ہوں محترم جناب محمد انور چیمہ، حافظ حفظ الرحمٰن، جناب ڈاکٹر حسن فاروقی، میاں ثناء اللہ، جناب جاوید اختر، حافظ محمد نور اللہ اور جناب محمد شبیر اور محمد احسن ظہیر کا جن کی ریڈیو پاکستان کے مذہبی پروگراموں کی پیش کش میں درجہ بہ درجہ قابلِ قدر خدمات ہیں اور جن کی معاونت اور نیک خواہشات میرے لیے باعثِ افتخار ہیں۔

خصوصی شکریہ جناب اعجاز وقار (اسٹیشن ڈائریکٹر پی بی سی فیصل آباد) اور جناب محمد جاوید باجوہ (اسٹیشن ڈائریکٹر پی بی سی سیالکوٹ) کا جن کے توسط سے اجازت نامہ برائے اشاعت حاصل ہوا۔

بہت شکریہ مثال پبلشرز فیصل آباد کا جنھوں نے ''تہذیبِ فکر'' کو حُسنِ طباعت سے آراستہ کیا۔

مزید برآں پروفیسر عابدہ حیات (شریکِ حیات) اور عزیز بچوں فصیحہ عمر، عبداللہ بن عمر اور حسّان بن عمر کا بھی شکریہ کہ وہ روشنی کی اشاعت پر خوش ہوئے۔

''ماں جی'' اور تمام بزرگوں کا بے حد شکریہ جن کی دِلی دُعائیں ہمیشہ شاملِ حال رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے تمام محسنین اور کرم فرماؤں کو ''فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة'' سے ہم کنار فرمائے۔ آمین!

(ڈاکٹر) عمر حیات

Marfat.com

چراغ جلتا رہے!

قرآن پاک کا ارشاد ہے "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" آسمانوں اور زمین کا نور اللہ تعالیٰ ہے۔ گویا ظلمت کدۂ دُنیا میں اگر روشنی، اُجالا اور نور جلوہ گر ہے تو وہ اس کائنات کے خالق و مالک، قادر و مقتدر ہستی ربّ العالمین کا ہے۔ اُس کا ہر فرمان اور حکم بھی ہدایت کا نور اور مہرِ منیر ہے جس کی بدولت دلوں کی ویران بستیوں میں اُجالا ہے اور نیکی، اخوت، مہر و محبت، انسان دوستی، بھائی چارے اور یگانگت کے دیے روشن ہیں۔ اللہ کا کلام، وحی الٰہی، اللہ کا نور ہے جو دِلوں کے تاریک گوشوں کو منور کرتا ہے اور اس گیتی سے حُسنِ اخلاق کے گلہائے رنگ رنگ مشکبار ہیں۔ قرآن نور ہے روشنی ہے، اُجالا ہے۔ اللہ کا پسندیدہ دین "ان الدین عنداللّٰہ الاسلام" نورِ ہدایت ہے اور اس ازلی وابدی پیغام کو لانے والے تمام مستودہ صفات انبیاء ورُسلؑ روشنی کا سمبل ہیں جن کی بدولت کرۂ ارض کے کونے کونے تک ہدایت کا درخشندہ آفتاب جگمگا رہا ہے اور دِلوں کے اندھیرے دم توڑ رہے ہیں۔

قرآن پاک اور سیرتِ طیبہ مشعلِ راہ ہیں اور جب تک اُمتِ مسلمہ ان منابع پر مضبوطی سے کاربند رہے گی کبھی ضلالت و گمراہی میں مبتلا نہ ہوگی۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اس ازلی وابدی نور کو بجھنے نہ دیا جائے بلکہ اس کی لَو کو اور تیز کیا جائے اور رہبرانِ تیز گام اس پیغام کو لے کر اطراف واکنافِ عالم تک برق رفتاری سے پہنچائیں۔ یہ فریضہ جہاں اُمت کے ایک طبقے پر

Marfat.com

واجب ہے وہاں فرداً فرداً بھی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا فریضہ ادا ہوتے رہنا چاہیے ــــ اس سلسلے میں برقی ذرائع ابلاغ بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب الیکٹرونک میڈیا کے اربابِ بست وکشاد اس حقیقی پیغام اور اس کی اہمیت کا درک رکھتے ہوں۔

الحمدللہ! ریڈیو پاکستان نے ابتداء ہی سے اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے اور شروع ہی سے اس کے تمام پروگراموں میں مذہبی نشریات ایک اہم اور جزوِلاینفک رہا ہے۔ جدید دور میں سانس لینے والی جدید نسل مغربی افکار کی یلغار سے یقیناً متاثر ہورہی ہے۔ ان کے اذہان کو رُوحانی واخلاقی قدروں سے روشناس کرانے کے لیے ریڈیو پاکستان نے ''روشنی'' کے عنوان سے تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو گزشتہ تقریباً ۴۰ سال سے نئی نسل کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دُور کرنے کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ مجھے چونکہ یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے اس پروگرام کو پیش کرنے اور اس کے فروغ وترویج کے لیے آغاز ہی سے بہت محنت کی، اس لیے میں اس کی قدر وقیمت سے کماحقہٗ آگاہ ہوں۔ اس پروگرام کو پیش کرنے والے حضرات کا انتخاب نہایت عرق ریزی اور اس احساس کے ساتھ کیا گیا کہ وہ روایتی علمائے کرام نہ ہوں بلکہ جدید علوم سے آراستہ اور اسلام کے حقیقی معارف کا بھی درک رکھتے ہوں۔ چنانچہ شروع میں عظیم براڈکاسٹر شاہ بلیغ الدین، نابغۂ روزگار شخصیت جناب حمید نسیم، جناب سلیم احمد، جناب محمود اعظم فاروقی، ڈاکٹر محمد یوسف، جناب اختر اعظمی، جناب کلیم اللہ اور مولانا شیر کوٹی نے اپنی فکر انگیز اور پُراز دلائل تقاریر سے سامعین کے دلوں کو مسخر کیا اور پروگرام ''روشنی'' ریڈیو پاکستان کا سب سے مقبول پروگرام ٹھہرا۔

مابعد اس میں قابل اہلِ علم حضرات کا شمول ہوتا رہا اور یہ پروگرام اب بھی روشنی بکھیر رہا ہے۔ نئے قلم کاروں اور براڈکاسٹرز میں پروفیسر ڈاکٹر عمر حیات انصاری کا نام نامی باعثِ افتخار ہے جن کے علمی تبحر، تحقیق وجستجو اور اسلام کے منور پیغام کو دلنشین انداز میں پیش کرنے کے اسلوب کی سامعین نے ہمیشہ تحسین کی۔ ان کی ریڈیو پاکستان کے پروگراموں سے وابستگی کو بھی تقریباً تین عشرے ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان کے بیشتر پروگراموں میں اپنا علمی جادو جگایا لیکن مذہبی پروگرام ''الہدیٰ'' اور قومی نشریاتی رابطے کا نہایت معتبر ومقبول پروگرام ''روشنی'' ان کی پہچان بن گیا۔ یہ سعادت بھی مجھے ہی حاصل رہی کہ ان کا نام ''روشنی'' کے مقررین میں شامل ہوا۔

Marfat.com

پروفیسر موصوف دینِ اسلام، قرآن پاک اور اسلامی تعلیمات کے متبحر عالم ہیں لیکن اس کے باوجود کبھی علمی تفاخر و تعلّی کا اظہار نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تحریر و تقریر کا بیش بہا ملکہ عطا کیا ہے اور وہ ادائیگی کے رموز یعنی آواز کے در و بست سے بھی آگاہ ہیں۔ اسی لیے ان کی تقاریر سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور یوں وہ اعلائے کلمتہ الحق کا فریضہ بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔

زیرِ مطالعہ مجموعہ پروفیسر صاحب کی ریڈیو تقاریر ''روشنی'' ہی پر مبنی ہے جسے انھوں نے کتابی شکل عطا کر کے ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے تاکہ نسلِ نو ان تقاریر کو پڑھ کر ذہنوں میں پیدا ہونے والے ریب و تردّد کو رفع کر سکے۔ کتاب کی زندگی انسانی زندگی سے زیادہ پائیدار اور محکم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آنے والے ہر زمانے میں اس سے روشنی حاصل ہوتی ہے، کتابیں قوموں کی تقدیر بدل دیتی ہیں اور ان کا فیض آنے والے وقتوں میں اور فزوں ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے اور پروفیسر صاحب کو اجرِ عظیم اور دُنیا و آخرت کی تمام تر بھلائیوں سے نوازے۔

ڈاکٹر عمر حیات انصاری بہت ہی منکسر المزاج ہیں، لہجہ دھیما لیکن گفتگو مدلل اور طریق ہمیشہ طالبِ علمانہ ہی رکھا ہے۔ یہی وہ ہے کہ انھوں نے علم و ادب کے گوہرِ نایاب اپنی شخصیت میں جمع کر رکھے ہیں جنھیں کوئی ماہر غوّاص ہی کھوج سکتا ہے۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے، نہایت ریسرچ اور جستجو سے قابلِ قدر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور یہ ان کا علمی کارنامہ بہت قدر و منزلت کا حامل ہے۔ سرزمینِ فیصل آباد نے بہت سی نابغۂ روزگار ہستیوں کو جنم دیا ہے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ میں پروفیسر عمر حیات میں بھی جوہرِ قابل دیکھ رہا ہوں۔ اللہ کرے وہ اس ریسرچ، مطالعہ، جستجو اور لگن کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائے رکھیں اور ان کا نام بھی فیصل آباد کی بلند مرتبت جگمگاتی شخصیات میں ہو، مجھے اُمید واثق ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم نہ ہوں گے لیکن زمانہ اس پر مہرِ تصدیق ثبت کرے گا۔ ان شاء اللہ!

ڈاکٹر عبدالستار

سابق ڈائریکٹر پروگرام

ریڈیو پاکستان

Marfat.com

اِنقلاب آفریں احساس

ماں نے بیٹی سے کہا کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی مِلا دو، کونسا اِس وقت خلیفہ دیکھ رہا ہے!
بیٹی نے جواب دیا کہ ماں جی! خلیفہ تو نہیں البتہ خلیفہ کا خدا ضرور دیکھ رہا ہے۔ اس لیے میں دودھ میں پانی نہیں ملاؤں گی۔

بس! اتنی سی بات ہے جو اصل میں بہت بڑی بات ہے، اور یہی وہ احساس ہے جو انسانی زندگی میں بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ ایک ایسا اِنقلاب جو سراسر احساسِ ذمے داری اور ادائے فرض کے جذبے سے عبارت ہے۔

اِسی احساس نے ظالم کو عادل اور حاکم کو خادم بنایا، شرم وحیا سے عاری کو زیورِ حیا داری دیا، بدزبان کو حسنِ تکلّم اور ناعاقبت اندیش کو فکرِ انجام سے ہمکنار کیا۔ گویا زندگی کی راہوں کا تعین ہو گیا۔

اصل میں انسان کی فطرت ہے کہ اپنے سے بڑے اور زیادہ طاقتور کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتا ہے اور جبکہ وہ طاقتور سامنے دیکھ بھی رہا ہو تو کمزور پر اور بھی زیادہ لرزا طاری ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی بادشاہ کے دربار میں اُس کے خُدّام اور رعایا کا یہ عالم کہ ہر کوئی بادشاہ کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ سب کے سب اُس کے سامنے بے حس وحرکت کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا جو بادشاہ کو ناگوار گزرے۔ بلکہ ہر کوئی حسبِ استطاعت تعمیلِ حکم کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرمانبردار بننے کی کوشش۔

Marfat.com

لوگوں کا یہ حال اُس بادشاہ کے دربار میں ہے جسے دنیا کی زندگی میں چندروزہ عارضی سا اقتدار ملا۔ نجانے کتنے لوگوں کو دنیا کی بادشاہی ملی جو اپنے اپنے وقت میں حکومت کرتے رہے، لوگ حکم بجالاتے رہے، خدام خدمت کرتے رہے۔

اِنسانی قوتِ فکر جسے عقل کہا جاتا ہے، انسان کو ایک ایسے حکمران کا بھی پتہ دیتی ہے جو پورے نظامِ کائنات پر حاوی اور قابض ہے۔ جس کے اِختیار میں نظامِ ہستی کا توازن اور تسلسل ہے۔ کوئی بھی چیز معرضِ وجود میں آنے سے لے کر انجام پذیر ہونے تک جس کی مرہونِ منت ہے۔ اس نظام کا ذرّہ ذرّہ یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ وہ بادشاہ ہر لحاظ اور ہر انداز سے بے مثال و باکمال و لازوال ہے، قادرِ مطلق ہے۔ ہر مخلوق کی ہر حالت ہر وقت اُس کے نوٹس میں ہے۔

ایسا حکمران جو زمان و مکاں کی حدود سے ماوراء، جس کی قوت و طاقت لامحدود، جس کی گرفت ناقابلِ برداشت، جس کی حکومت کی حدود سے اِنسان مر کر بھی نہیں نکل سکتا، ذرا سوچیے! کہ اُس ذات سے انسان کو کس قدر زیادہ ڈرنا چاہیے اور اس کے سامنے ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ یہ ایسی بات ہے جو کسی بھی تفصیلی وضاحت اور تعارف کی محتاج نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس وحدہٗ لاشریک قادرِ مطلق حکمران کی قدرت اور عظمتِ شان کا اِحساس اگر ہمارے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے تو ہماری ترجیحات بدل جائیں اور ہم اول و آخر آفاقی اور مبنی برحق و صداقت، نظامِ فکر و عمل کو اولین حیثیت دیں اور اُس کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔

ایک زندہ احساس کے تحت اگر ایسا ہو جائے تو معاشرہ بے ایمانی اور بدعنوانی سے پاک ہو جائے، پھر کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی، کسی کی گردن نہیں ماری جائے گی، کسی کا گھر نہیں جلایا جائے گا، کسی کو غلام نہیں بنایا جائے گا، کسی سے جبری مشقت نہیں لی جائے گی، کسی بے گناہ کو سزا نہیں ملے گی، کوئی ناپ تول میں کمی نہیں کرے گا، کسی کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوگی۔ بعنوانی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اِسی لیے تو دینِ فطرت اس اِحساس کو اُجاگر کرنے کی یوں تعلیم دیتا ہے کہ معبودِ برحق کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ پھر اگر تم اُسے نہیں دیکھ رہے تو یہ یقین کر لو کہ وہ احکم الحاکمین تو بہر حال تمہیں دیکھ رہا ہے۔

□□□

Marfat.com

امن کا ضامن معاہدہ

امن وسلامتی اِنسان کی ضرورت ہے۔ جس طرح کھائے پیئے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اِسی طرح امن وسلامتی کے بغیر اجتماعی معاشرتی زندگی کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ خوف وہراس، مایوسی اور بے یقینی کی فضاؤں میں معاشرہ ترقی اور خوش حالی سے محروم ہو جاتا ہے۔

اِسلام دینِ سلامتی ہے۔ دنیا کو امن وسلامتی اور صلح وآشتی کا پیغام جس اہتمام کے ساتھ دینِ اسلام میں دیا گیا ہے کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔ اِنسانی حقوق کے تحفظ کے لیے جو لائحہ عمل اِسلام نے دیا ہے کسی اور نے نہیں دیا۔ فرائض سے کما حقہ، عہدہ برآء ہونے کا احساس جس طرح اِسلام نے اجاگر کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔

اِسلام اجتماعیت کا دین ہے، عدل اجتماعی اور مفادِ عامہ کا تقاضا کرتا ہے۔ معاشرے میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم خیال بھی اور مختلف الخیال بھی، اپنے بھی غیر بھی، مسلم بھی غیر مسلم بھی۔ یہ صرف اسلام ہے کہ معاشرہ جب بھی اِس دین کی بنیاد پر قائم ہوا تو معاشرے کا ہر ہر فرد فیض یاب ہوا۔ سب کی شکایات کا ازالہ ہوا، سب کو یکساں حقوق ملے، سب کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔

آیئے ایک نظر اُس معاہدے کی چند شقوں پر ڈالتے ہیں جسے تاریخ میں میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ اِسلام کے سیاسی نظام اور اِس کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت اور امن وامان کے قیام کی ضمانت!

Marfat.com

حضور سیدِ عالم محمد رسول ﷺ کی زیرِ نگرانی یہ معاہدہ اہلِ اسلام اور یہود مدینہ کے درمیان طے پایا تھا، جس میں یہود کو عقیدہ و مذہب اور جان و مال کی مطلق آزادی دی گئی تھی۔ اس کی اہم دفعات کچھ یوں تھیں:

- یہود اور مسلمان معاشرتی لحاظ سے ایک ہی جماعت تصور ہوں گے۔ وہ اپنے اپنے عقیدہ و مذہب کی پیروی میں آزاد ہوں گے۔ یہی آزادی ان کے غلاموں اور متعلقین کو بھی حاصل ہوگی۔
- فریقین معاہدہ اپنے اپنے دفاعی اخراجات کے ذمے دار ہوں گے۔
- جو کوئی بھی اس معاہدے کے کسی فریق سے جنگ کرے گا اُس کے خلاف آپس میں تعاون کیا جائے گا۔
- معاہدے کے شرکاء کے باہمی تعلقات خیر خواہی اور نفع رسانی کی بنیاد پر قائم ہوں گے، ظلم، گناہ اور بدنیتی کی بنیاد پر نہیں۔
- کسی شخص کو اُس کے حلیف کی وجہ سے مجرم نہیں ٹھہرایا جائے گا۔
- مظلوم کی مدد کی جائے گی۔
- جنگ کی صورت میں مسلمان اور یہود مل کر جنگی اخراجات برداشت کریں گے۔
- معاہدے کے تمام شرکاء پر مدینہ کے اندر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور کشت و خون حرام ہوگا۔
- اختلاف یا جھگڑے کی صورت میں معاملے کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے کروایا جائے گا۔
- معاہدے کا کوئی فریق قریش اور اُس کے مددگاروں کو پناہ نہیں دے گا۔
- مدینہ پر بیرونی حملے کی صورت میں مسلمان اور یہود مل کر جوابی کارروائی کریں گے۔ ہر فریق اپنے اپنے اطراف کا دفاع کرے گا۔
- یہ معاہدہ کسی ظالم یا مجرم کے لیے آڑ نہیں بنے گا۔

میثاق مدینہ ایسی تاریخی دستاویز ہے جو اپنی نوعیت میں بے مثال ہے۔ اس کی بنیاد پر دنیا کی پہلی اسلامی ریاست معرض وجود میں آئی جس کا مرکز اور دارالخلافہ مدینہ منورہ قرار پایا۔ یہ دستاویز وہ متفقہ قرارداد ہے جس کے تحت رسول اللہ ﷺ کو سربراہِ ریاست و حکومت تسلیم کیا گیا۔ اس قرارداد کے ذریعے ریاست کو درپیش اندرونی اور بیرونی ممکنہ خطرات سے تحفظ فراہم ہوا اور

Marfat.com

معاشرے میں امن وسلامتی کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

میثاق مدینہ مشعل راہ ہے جس کی روشنی میں اِسلام کی معاشرتی اور سیاسی حکمتِ عملی اور نبوی فراست، رواداری اور وسیع الظرفی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ روشنی ہر دور کے لیے ہے۔

□□□

ے اِن نئے راستوں کی غلط روشنی
ہم کو راس آئی ہے اور نہ راس آئے گی
ہم کو کھوئی ہوئی روشنی چاہیے
ہم کو آئینِ خیرالبشرؐ چاہیے

Marfat.com

اِتحاد کا راز

معاشرے کی بقاء کا راز اجتماعیت کے تصور میں مضمر ہے۔ افراد کے منظم اجتماع کو معاشرہ کہا جاتا ہے۔ ایک فرد کا وجود معاشرہ نہیں ہوتا۔ گویا معاشرتی زندگی اتحاد و یگانگت کی متقاضی ہے اور قوموں کی زندگی میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ نسلِ انسانی کو پیدا بھی ایک جماعت یا امت کے طور پر کیا گیا تھا۔ گویا یہ فطرت کا بھی تقاضا ہے کہ نسلِ انسانی کے درمیان اتحاد و اتفاق رہے۔ افراد ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث بنیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں اور ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا لحاظ کریں۔ اختلاف رائے تو ہو جاتا ہے مگر ایسے اختلاف سے بچیں جو کسی تنازعے کو جنم دے اور تنازعہ دشمنی کی شکل اختیار کر جائے۔

افراد اور اقوام کا اتحاد ہمیشہ مشترکہ قدروں پر قائم ہوتا ہے۔ اتحاد کے پائیدار یا عارضی ہونے کا انحصار بھی انہی مشترک باتوں پر ہوتا ہے۔ ایسی باتیں ہر مخلوق میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ہر جنس کی مخلوق مل جل کر رہتی ہے۔ چرند پرند، حیوانات وغیرہ سب کے سب جبلی طور پر ایسے ہی رہتے ہیں۔ مگر اصل میں دعوتِ فکر انسان کے لیے ہے کیونکہ یہ صاحبِ شعور ہے۔ ایک تو دوسری مخلوق میں پایا جانے والا اتحاد انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے اور دوسرے فطرت انسانی کا تقاضا بھی ہے کہ انسان اس سلسلے میں غور و خوض کرے اور اتحاد و اتفاق کی ضرورت

Marfat.com

محسوس کرے۔

جہاں تک نسل انسانی کے درمیان پائی جانے والی مشترک قدروں کا تعلق ہے تو وہ بہت سی باتیں ہیں، مثلاً انسان کا انسان ہونا قطع نظر رنگ و نسل یا کسی اور بات کے انسان ہونے کے ناطے سب لوگ برابر ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں۔ صدیوں سے نسل در نسل پیدا ہونے والی نوعِ انسانی کے ماں باپ ایک ہیں۔ تمام تر نسلِ انسانی کی اصل یعنی مادۂ تخلیق ایک ہے یعنی مٹی۔ سب کا مقصدِ زندگی ایک ہے، عبادت و بندگی۔ سب کو وحدہٗ لاشریک خالق نے پیدا کیا۔ سب کے لیے ہدایت کا یکساں اہتمام کیا گیا۔ سب کے روحانی اور جسمانی تقاضے بھی یکساں ہیں۔ سب کے لیے فطرت کا ایک ہی اصول ہے اور انجام کار سب کے سب اپنے رب کے حضور پیش ہونے والے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت سی باتوں میں غور و فکر کرنے کا سامان پایا جاتا ہے کہ نسل انسانی میں جب اتنا کچھ مشترک ہے تو اِسے فکری اور عملی یگانگت کا ثبوت بھی فراہم کرنا چاہیے۔ مگر ایک ہونے کے باوجود حرص و ہوس نے نوعِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ ذاتی مفادات اجتماعی مفاد پر بازی لے گئے۔ ہوسِ اقتدار نے قوموں اور حکومتوں کو باہم لڑا دیا اور بڑی بڑی خوں ریز داستانیں رقم ہوئیں۔

مختلف مذاہب اور فرقوں کے نام پر اختلاف کر کے قوموں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا گیا حالانکہ تمام نبیوںؑ اور رسولوںؑ کی بنیادی تعلیم شروع سے آخر تک ایک رہی ہے۔ مذاہبِ عالم کا بنیادی نظریہ اور تصور مشترک رہا ہے۔ بنیادی اخلاقیات میں بھی بہت حد تک یکساں باتیں پائی جاتی ہیں۔ کیا سب نبیوں نے یہ تعلیم نہیں دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں! یہ نکتۂ توحید ہے جو سب نبیوں کی تعلیم کی قدرِ مشترک ہے۔ بنیادی سچائی، بنیادی نکتہ جس سے تمام سچائیوں اور فکر و نظر کی راہیں کھلتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ قانون کی حکمرانی کی بات ہے جس کی دعوت و تبلیغ ہر نبی کی دعوت و تعلیم کی بنیاد رہی ہے۔ اس بات سے چشم پوشی ممکن نہیں۔

بعثتِ محمدی ﷺ جس میں تمام نبیوںؑ کی تعلیم کو جامع انداز میں پیش کر دیا گیا۔ اہلِ کتاب کے سامنے نکتۂ توحید ہی پیش کرتی ہے کہ یہ اصل میں پوری نسلِ انسانی کی مشترک قدر ہے۔ اگر یہ نکتہ سمجھ میں آ جائے جو کہ سمجھنے کے لیے نہایت آسان بھی ہے تو عالم گیر اتحاد کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

یہ نکتہ آخری رسول ﷺ کی اُمت کے حوالے سے اور بھی زیادہ فکر انگیز ہے کیونکہ اقوامِ عالم میں سے صرف اس اُمت کو خیر الامم کہا گیا ہے۔ یہ عظیم تر منصب اقوام عالم کی قیادت کا منصب ہے۔ اس منصب کا تقاضا ہے کہ اُمتِ مسلمہ قرآن کی روشنی میں اپنی حیثیت کو پہچانے، اپنی منزل کو جانے اور دنیا کی قیادت کرے۔ یہ خواب اِتحاد کی برکت سے فیض یاب ہوئے بغیر شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

□□□

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

Marfat.com

علم کا کرشمہ

تلاش و جستجو میں رہنا اور جاننے کی کوشش کرنا تقاضائے فطرت ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ وہ علم و آگہی حاصل کرے اور کائنات کی حقیقت تک رسائی کی جستجو کرے۔ اس بات کا اندازہ بہت چھوٹے بچوں کی حرکات سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو کھلونوں سے کھیلتے کم اور ان کو توڑتے زیادہ ہیں۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کھلونے کے اندر کیا ہے؟ وہ چلتا کیسے ہے؟ جاننے کی یہ فطری خواہش عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اِنسان مختلف قسم کے علوم و فنون کے حصول میں مصروفِ عمل رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔

قدرت کے بے بہا خزانوں سے علم و عرفان کی دولت انسان کو وافر ملی ہے۔ اس کی بدولت انسانی عظمت و فضیلت کا تعین ہوا۔ انسان کے سر پہ مسجودِ ملائکہ ہونے کا تاج سجا اور اِسے 'خلیفۃ اللہ فی الارض' ہونے کا عظیم الشان شرف و اعزاز مِلا، اور جس نے انسانی عظمت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اُس کی عمر بھر کی کمائی غارت ہوئی اور لعنت و ملامت اس کا مقدر ٹھہری۔ غرور کا سر ہمیشہ کے لیے نیچا ہو گیا۔ ''اِنّی اعلم مالا تعلمون'' کی تفسیر منظرِ عام پر آ گئی۔ قدرت کی ودیعت کردہ علمی برتری اور قوتِ فکر و نظر کی بنا پر انسان اشرف قرار پایا۔

علم و حکمت کا ماخذِ اصلی ربِّ کائنات کی ذات ہے، جو اللہ ہے، وحدہٗ لاشریک ہے۔ اصلِ وجودِ کائنات ہے۔ ہر ظاہر و باطن کا جاننے والا، علیم و خبیر، علام الغیوب، علیمٌ بذاتِ

Marfat.com

الصدور! اُس نے چاہا کہ شعوری مخلوق اُسے جانے، اُس کی ذات کا عرفان حاصل کرے اور اُس کی بنائی ہوئی کائنات کی حقیقت کو جاننے کی جستجو کرے۔ اللہ نے ہر اُس شخص کو درجۂ فضیلت پر فائز کر دیا جو اُس کی ذات سے واقف ہو کر صمیمِ قلب سے اُس پر ایمان لایا اور اُس کے حکم کے تحت حصولِ علم کے راستے پر چلا۔ سلسلۂ نبوت و رسالت کا بڑا اور بنیادی مقصد نسلِ انسانی کو یہی راستہ دکھانا تھا۔

سلسلۂ ہدایت تمام ہوا۔ ابدی پیغام ہدایت دے دیا گیا۔ اُس کا دیباچہ بھی علمی حوالے سے عبارت ہوا جو دینِ فطرت کی عظیم تر علمی و فکری تحریک کا نقطۂ آغاز بنا اور اس تحریک نے دنیا کی ہر قوم اور ہر تہذیب پر گہرے اور لازوال علمی و تہذیبی نقوش مرتب کیے، انسانی تہذیب کی آبیاری اور کاروانِ تہذیب کی راہنمائی کی اور اقوامِ عالم کو ہدایت، ایمان اور علم و عرفان کی روشنیوں سے بھر دیا۔ اس کارواں کی قیادت کا منفرد افتخار یہ رہا کہ یہ عظیم تر فریضہ حضور سید کائنات محمد رسول اللہ ﷺ نے ادا فرمایا۔ وہ ذاتِ اقدس کہ جسے رب کائنات نے معلّمِ انسانیت کے روپ میں مبعوث فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان اس امر پر مہرِ تصدیق ہے۔ ''بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' تعلیم کا مقصد اصلاحِ کردار اور تربیتِ اخلاق ہے۔ اس حوالے سے بھی آپ ہی کی ذات سب سے آگے ہے، اخلاق حمیدہ کی تکمیل اسی ذات پر ہوئی۔ قرآن کی گواہی ان الفاظ میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ''وانَّكَ لَعلٰى خُلُقٍ عظيم'' آپؐ نے اپنا مقصدِ بعثت ہی یہ بیان فرمایا کہ ''بُعِثت لِاُ تَمِّمَ مكارم الاخلاق''، یعنی حُسنِ اخلاق کی تکمیل۔

اِنسانی عظمت اور اِمتیاز کا انحصار علم و حکمت پر ہے۔ انسانی معاشرے نے جس قدر بھی ترقی کی ہے، تہذیب و تمدن کو پروان چڑھایا ہے اور تسخیرِ کائنات کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس کا راز علمی و تحقیقی جستجو میں مضمر ہے۔ دینِ فطرت جو انسانی عظمت کا علمبردار ہے، سب سے پہلے علم اور ذرائع علم کی بات کرتا ہے۔ حصولِ علم پر زور دیتا ہے اس لیے کہ انسان کا جاہل رہنا مقامِ انسانیت کے منافی ہے۔ خبردار کیا گیا ہے کہ اہلِ علم اور جاہل لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک حدیث نبویؐ کا مفہوم ہے کہ علم حاصل کرو، اللہ کے لیے علم حاصل کرنا نیکی ہے۔ علم سکھاؤ تو صدقہ ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو علم حاصل کرتے ہیں اور بدقسمت اس سعادت سے محروم رہتے ہیں۔

Marfat.com

انسان سے حصولِ علم کا تقاضا ایک لازمی تقاضا ہے جو فرضیت کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں حضور سیّدِ عالم معلم انسانیت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ حصول علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ فریضہ جز وقتی عمل نہیں بلکہ عمل مسلسل ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔ اللہ کے دین میں اس بات کو پسند کیا گیا ہے کہ انسان زندگی بھر علم کی تلاش میں رہے۔

علم ہر دور کے انسان کی بنیادی ضرورت رہا ہے۔ اس کی اول و آخر اہمیت یہ ہے کہ علم کے بغیر انسان ایمان اور عمل کی حقیقت کو نہیں جان سکتا۔ گویا علم و دانش اور فہم و فراست اصل روشنی ہے جس سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ یہ ہدایت کی روشنی ہے جو منزلِ مقصود کا پتہ دیتی ہے۔

□□□

Marfat.com

قوم کا سردار — قوم کا خادم

گھر میں کھانے پینے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ بچے بھوک سے روتے روتے سو گئے تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ گھر والوں کو حیرت ہوئی کہ اِس وقت کون ہوسکتا ہے! دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک شخص سامان سے بھری بوری سر پہ اُٹھائے کھڑا ہے اور اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ اندر جا کر اس نے بوری سَر سے اُتاری جو اشیائے خورونوش سے بھری ہوئی تھی۔ غربت کے مارے، بھوکے پیاسے افرادِ خانہ نے یہ سب کچھ دیکھا تو اُنکی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ دل سے اجنبی شخص کے لئے بے ساختہ دعائیں نکلیں جو عالمِ یاس میں ان کے لئے اُمید کی روشنی بن کر خوشی اور خوشحالی کا پیغام لایا تھا۔

اُس اجنبی نے گھر والوں سے کہا کہ کھانا تیار کرو اور چولہے پر سے وہ ہنڈیا اُتار دو جو محض بچوں کو بہلانے کے لئے رکھی ہوئی تھی اور جس کے پکنے کے انتظار میں وہ بے چارے تھک ہار کر بے سُدھ ہو چکے تھے۔ کھانا بنانے میں اُس نے خود بھی گھر والوں کا ہاتھ بٹایا۔ کھانا تیار ہوا، بچوں کو جگایا گیا۔ اُس خدا ترس اِنسان نے اپنے ہاتھوں سے اُن کو کھانا کھلایا، اُنہیں پیار کیا۔ اب اُن کی آنکھوں میں اُمید کی روشنی تھی اور چہرے کھلے ہوئے تھے۔ وہ شخص کچھ دیر اُن کے ساتھ رہا، گھر والوں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہا اور پھر چلا گیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اُسے کیسے پتہ چلا کہ اُس گھر میں بھوک کے سائے منڈلا رہے

Marfat.com

ہیں اور اُس آنگن کے پھول مرجھا رہے ہیں۔ اصل میں وہ ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں گھر سے نکلا ہوا تھا ورنہ گھر بیٹھے تو دوسروں کے حالات معلوم نہیں ہوتے! یہ تو جان جوکھوں کا کام ہے۔ کون کسی کے لئے راتوں کی میٹھی نیند قربان کرتا ہے۔ مگر وہ خادم خلق رات کے وقت گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اُس گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آئی جو کئی دنوں سے بھوکے تھے۔

یہ اجنبی خادمِ خلق خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروقؓ تھے کہ مسندِ خلافت پر بیٹھ کر بھی خود کو دوسروں سے ممتاز نہیں کیا، حکومت اور سلطنت کو عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ "سیّد القومِ خادِمھم" کی لازوال عملی داستان رقم کی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دریا کے کنارے اگر بکری کا ایک بچہ بھی پیاسا مر گیا تو اُس کی ذمے داری بھی عمر پر عائد ہوگی۔ چنانچہ اپنی ذمے داریوں اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے تحت اللہ کے خوف سے لرز جاتے اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر گلیوں میں گشت کرتے اور بھیس بدل بدل کر عوام الناس کے حالات کا پتہ لگاتے تاکہ غربت و افلاس زدہ لوگوں کو بیت المال سے مالی اِمداد بہم پہنچائی جائے اور اُن کی مشکلات کو کم کیا جائے۔ یہ کام وہ حاکمِ وقت کی حیثیت سے بنفسِ نفیس انجام دیتے کہ ہر ذمے دار کو اپنی ایک ایک ذمے داری سے بذاتِ خود عہدہ برآ ہونا چاہیے کیونکہ اُس کے بارے میں اُسی سے باز پرس ہوگی اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔

اصل میں ایثار و قربانی اور ہمدردی کا جذبہ اِنسانی عظمت کردار کی دلیل ہے، جو اِحساسِ ذمے داری کے نتیجے میں اُبھرتا اور پروان چڑھتا ہے۔ اسی احساس کے تحت زندگی کی راہوں کا تعین ہوتا ہے۔ جتنا کوئی بڑا ہوتا ہے اُتنا ہی زیادہ ذمے دار ٹھہرتا ہے۔ جس کے اندر یہ جذبہ موجزن ہو جائے وہ دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔

آج بھی معاشرے میں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو سخت غربت اور پسماندگی کا شکار ہیں، جو خوراک، لباس اور رہائش تک سے محروم ہیں، جو تعلیم سے عاری ہیں، جنہیں ہمدردی اور مالی تعاون کی ضرورت ہے۔ اُن کی آنکھیں کسی خادم خلق کی راہ تک رہی ہیں کہ وہ آئے اور ان کی زندگی آسان ہو جائے۔ بہت سے مرجھائے ہوئے پھول کھل اُٹھیں اور معاشرے میں خوشی کی لہر دوڑ جائے۔

□□□

Marfat.com

بے مثل صبر و ثبات

کچھ ایسی باتیں ہیں جو عام طور پر انسان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں اور اُس کے راستے میں حائل ہو کر اُسے سچائی سے روکتی ہیں، عدل و انصاف کے تقاضوں کو مجروح کرواتی ہیں اور راہِ حق میں اُٹھے ہوئے قدموں کو لوٹا دیتی ہیں۔ دنیا کی دولت اور حکومت کا لالچ، کسی نقصان کا خوف اور کسی کی دوستی یا دشمنی، انسان کی آزمائش میں یہی عوامل کارفرما ہیں اور یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے۔

بہت سے لوگ بڑے بڑے عزائم اور مقاصد کو لے کر اُٹھے، مگر یا تو اُنہیں دولت کا لالچ لے ڈوبا، یا کسی نے ڈرا دھمکا کر اُن کے حوصلے پست کر دیے یا پھر وہ دوستی یا دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر رہ گئے۔

کفارِ مکہ نے اپنے میں سے ایک بڑے ہی ذہین شخص کو اس پیغام کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بھیجا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کو پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ اگر چاہیں تو دولت کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ آپ دعوتِ دین سے دستبردار ہو جائیں۔

اتنا بڑا لالچ! شاید وہ اس سے زیادہ کی پیش کش نہیں کر سکتے تھے ورنہ وہ تو اللہ کے دین کا راستہ روکنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ یہ گویا اُن کی طرف سے لالچ کی انتہا تھی جو

Marfat.com

کسی کی بھی زباں بندی کے لیے کافی ہوسکتا تھا، جس سے کسی کے بھی پائے استقلال ڈگمگا سکتے تھے اور کوئی بھی اتنے بڑے لالچ میں اندھا ہوکر سودے بازی کر سکتا تھا۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل ہی اُلٹ نکلا۔ جسے یہ پیش کش کی جارہی تھی وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ جس کا اول و آخر ہر حال میں مقصد یہ تھا کہ نوعِ انسانی معبودانِ باطل کی غلامی سے رہا ہو جائے۔

چنانچہ باطل کے پجاریوں کے نمائندے کے جواب میں آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ اُسے اُس ذاتِ وحدہٗ لاشریک کا پیغام سناتے ہیں جو ہر ہر شے کا خالق و مالک ہونے کے ناتے معبودِ برحق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کی چند آیات کی تلاوت فرماتے ہیں تو اُس شخص کی ساری ذہانت خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے اور اُس کی مذموم پیش کش کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔

ایک دن کفار کا ایک وفد جناب ابوطالب کے پاس پہنچ گیا۔ سخت غصے اور انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اپنے بھتیجے کو باز کرلو ورنہ ہمارے حوالے کردو۔ ڈرایا دھمکایا اور جان سے مار ڈالنے کا اعلان بھی کیا۔ مگر پرعزم بھتیجے کی بے مثال جوانمردی دیکھ کر چچا میں ایک نیا جوش، نیا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مصائب و آلام، خوف و ہراس، دھمکیوں، شرارتوں، اذیتوں اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کفار تو ایک لمحے کے لیے بھی شجرِ اسلام کو پھلتا پھولتا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب تو اُن کی آتشِ حسد و انتقام کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

دارالندوہ میں قرارداد پاس کی جاتی ہے کہ کفر و باطل کی مخالفت کرنے اور دعوتِ حق دینے والوں کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اس بدنامِ زمانہ قرارداد پر من وعن عمل ہوتا ہے اور الصادق والامین رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں سمیت مسلسل تین سال تک نظر بندی کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔

گلیوں میں سے گزرتے تو مشرکین راستوں میں کانٹے بچھا کر اور جسمِ اطہر پر گندگی پھینک کر نفرت کا اظہار کرتے۔ بہتر نتائج کی اُمید پر طائف تشریف لے گئے تو لہولہان ہو کر واپس آئے۔ مخالفین جب جوشِ انتقام میں بالکل ہی اندھے ہو گئے تو انہوں نے منصوبۂ قتل ترتیب دے دیا۔

Marfat.com

ایک طرف یہ بدترین حالات اور دوسری طرف محسنؐ انسانیت کی اُولوالعزمی اور اِستقامت، جو اپنی پوری عظمت شان کے ساتھ باقی رہی۔ آپؐ کسی سے ناراض نہیں ہوئے، کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی کو بددعا نہیں دی۔ بس! اپنے کام سے کام رکھا، مخالفتوں کے طوفان اور ظلم وتشدد کے تپتے ہوئے میدان میں صبر واستقامت کا لازوال باب رقم کیا۔ یہاں تک کہ باطل کا سارا کرو فر خاک میں مل گیا۔ زبانِ اقدس سے نکلا ہوا کلمہ اقدس چار دانگِ عالم میں گونج اُٹھا اور ہدایت کی روشنی ہر سُو پھیل گئی۔

ے ساری صدیوں پہ جو بھاری ہے وہ لمحہ ملتا
کاش! سرکارؐ دو عالم کا زمانہ ملتا

آپؐ کو دیکھتا مکّے سے میں ہجرت کرتے
آپؐ کا نقش قدم، آپؐ کا رستہ ملتا

□□□

Marfat.com

فطرت جھنجھوڑتی ہے!

اِنسان کو چاہیے کہ خودسری چھوڑ دے اور اطاعت و فرمانبرداری کی زندگی اِختیار کر لے، قانون کی پابندی کا اہتمام کرے اور ایسے نظامِ فکر و عمل پر انحصار کرے جس میں تمام اِنسانی تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہو۔ جس سے اس کی عزت و تکریم میں اضافہ ہو، شرف و اعزاز کا تحفظ ہو۔

زمانۂ جاہلیت کے معاشرے کی بنیادی خرابی یہی تھی کہ وہ معاشرہ مجموعی طور پر آوارگی اور بے لگامی کا شکار ہو چکا تھا۔ کوئی ایسا ضابطہ نہیں تھا جو زندگی کی شیرازہ بندی کرتا۔ لوگ مظاہرِ فطرت کو طاقت کا اصل سرچشمہ سمجھتے ہوئے اُن سے خوفزدہ تھے اور اِس ذہنی کیفیت کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے مجسّموں کو اپنا معبود بنالیا۔ حالانکہ یہ بات تو عام آدمی کی سمجھ میں بھی آسانی سے آنے والی ہے کہ جب ایک ہی سطح کی دو چیزوں میں سے ایک، دوسری کے آگے جھک جائے تو وہ اُس کے مقابلے میں ہیچ اور کمتر ہو جاتی ہے۔ اور جب ایک اعلیٰ درجے کی مخلوق اپنے سے کمتر چیزوں کے آگے جھکتی ہے تو یہ اُس اعلیٰ مخلوق کی پستی کی اِنتہا ہوتی ہے۔

چنانچہ اصول کی بات یہ ہوئی کہ انسان نہ تو مظاہرِ فطرت کے آگے جھکنے کی کوشش کرے کیونکہ وہ سب اس سے کمتر ہیں اور اس کے لیے مسخر کیے گئے ہیں:

؎ نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

Marfat.com

اور نہ ہی اپنے جیسی مخلوق کے آگے دامن پھیلائے، کیونکہ اِن دونوں صورتوں میں اس کی تحقیر کا پہلو پایا جاتا ہے۔ مقامِ انسانیت کے دفاع میں اقبالؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

؎ فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے
میں مسجودِ ملائک ہوں، مجھے اِنسان رہنے دو

فہم وادراک اور قوتِ فیصلہ کی حامل مخلوق ہونے کے ناتے اِنسانی فطرت اِس بات کی متقاضی ہے کہ انسان کو تحقیق اور دلیل کی زبان میں بات کرنی چاہیے اور حقیقت کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ دوسروں کے مقابلے میں یہی اِس کا امتیاز ہے اور یہی عظمتِ کردار! چنانچہ دورِ جاہلیت میں جب ہر کسی نے معبودِ باطل پر تکیہ کر لیا اور جھوٹے معبودوں کی بھرمار نے معاشرے کا حلیہ بگاڑ دیا، تو ایسے میں دینِ فطرت انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتا اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ قرآن پکارتا ہے کہ لوگو! اپنے اُس پروردگار کی بات مانو جو تم سب کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس پکار نے پورے ماحول میں تہلکہ مچا دیا۔ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اُنہیں کیا کرنا چاہیے؟ اُنہیں خبردار کیا گیا کہ مخلوق جب تک اپنے خالق کی بات نہ مانے فلاح یاب نہیں ہو سکتی۔ واقعی یہ تو ہے ہی مسلمہ اصول کی بات۔

یہ پکار بڑی ہی غیر معمولی تھی۔ لوگوں کو عجیب تو لگی کہ صدیوں سے نسل در نسل وہ جو کچھ کرتے چلے آرہے تھے اُس کی نفی ہو رہی تھی۔ لیکن چونکہ حقیقت یہی تھی جس سے فرار کا مطلب ابدی تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر بھی صدیوں پرانے عقل پر پڑے پردوں کی بدولت لوگوں نے محاذ آرائی کی اور حق وصداقت کی اس آواز کو دبانے کی بہت کوشش کی۔ مگر حق و باطل کے تصادم میں جیت بالآخر حق کی ہوئی۔

رُشد وہدایت کی روشنی گمراہی کے اندھیروں کو چیرتی ہوئی اپنا کام کر گئی، دلوں کی گہرائی تک پہنچ گئی، بصارت کو بصیرت کا قرینہ آ گیا۔ انسان کو معبودانِ باطل کی غلامی سے رہائی مل گئی۔ اس نے معبودِ برحق کے حکم اور قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کیا تو پتہ چلا کہ اصل ضابطہ تو خالقِ برحق کا دیا ہوا ضابطہ ہے، جس سے معاشرے میں اصلاح وفلاح کا عمل جاری ہوتا ہے۔ زندگی اپنے اصل مرکز پر آ جاتی ہے اور معاشرہ صحیح معنوں میں انسانوں کے رہنے کے قابل بنتا ہے۔

□□□

Marfat.com

جب خوفِ خدا نہ رہے!

صبح سویرے تو بہت سے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سارا باغ مہک رہا تھا۔ بہت ہی خوشگوار سماں تھا۔ مگر شام کو باغبان نے دیکھا کہ بہت سے پھول مرجھائے ہوئے تھے، کچھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ پتیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ پورے ماحول پر خوف اور بے رونقی کی کیفیت طاری تھی۔ باغ ویران، سماں اُداس! باغبان کو بہت دکھ ہوا، دیر تک حیرانی اور پریشانی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ پھول تو اُس کی خون پسینے کی محنت کا نتیجہ اور اُس کی زندگی کا حاصل تھے۔ وہ بے چارا سیر کرنے والوں کو کیا سمجھاتا کہ اُن پھولوں کی آبیاری میں تو اُس کا خونِ جگر شامل تھا۔

اصل میں باغ کی ساری رونق پھولوں سے ہے۔ اِدھر پھول شاخ سے الگ ہوا اور اُدھر باغ ماتم کدے کا منظر پیش کرنے لگا۔ یہ بظاہر تو معمولی سی بات ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھی دعوتِ فکر ہے۔

یہ دنیا بھی ایک باغ ہے جسے گلزارِ ہست و بود کہا جاتا ہے۔ اس میں بہت سے رنگ پائے جاتے ہیں جن کے امتزاج سے معاشرے میں خوبصورتی، رعنائی اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس گلزارِ ہست و بود کی فضا کو خوش نما بنانے میں قدرت کی فیاضیاں خاص اہتمام کے ساتھ کارفرما رہتی ہیں۔ رنگوں کی اس کہکشاں میں جس رنگ کے بغیر سب کچھ پھیکا اور بے رونق ہے وہ اُن پھولوں کا رنگ ہے جن کو ہم نونہال یا بچے کہتے ہیں۔

Marfat.com

بچوں سے زندگی میں حسن ہے، یہ زندگی کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہیں۔قوموں کا مستقبل ہیں۔ اِن پھولوں کی خواہش ہر کسی کی خواہش ہے۔بچوں کا تحفظ قوموں کا تحفظ ہے۔ان کو نقصان پہنچانا کسی بھی بڑے سانحے سے کم نہیں۔کوئی قوم خواہ ترقی یافتہ ہو یا ترقی پذیر، سادہ مزاج ہو یا تصنع پسند، اکثریت میں ہو یا اقلیت میں، اس کی نسل کوئی بھی ہو، مذہب کوئی بھی ہو، سب کے بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بے قصور، غیر جانبدار۔

دنیا میں مختلف قوتیں باہم ٹکرا سکتی ہیں۔تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوسکتا ہے، مگر کسی دشمنی کی آڑ میں کسی قوم کے نونہالوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنانا، اُن کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگنا بدترین انسان دشمنی کے سوا کچھ اور نہیں۔ جو بھی ایسا کرتا ہے اُسے سوائے اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ بصیرت اور ہدایت کی روشنی سے محروم ہے۔

یقیناً یہ حرکت اخلاقی گراوٹ کی انتہا ہے کہ کوئی طاقت کے نشے میں بے گناہوں کی جانوں سے کھیلتا پھرے اور حقوقِ انسانی کو کچلتے ہوئے بچوں تک کے قتل سے دریغ نہ کرے۔ مہذب اقوام کی اخلاقی تعلیمات میں تو ہمیشہ اِس بات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ اول تو کسی کو بھی تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے یا کم از کم عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔تاکہ کسی حد تک تو احترام انسانیت کی پاسداری ہوسکے، اخلاقیات اور تہذیب وشائستگی کے دعوؤں کا کچھ تو بھرم رہ سکے!

آج کا دور اِس حوالے سے بہت پر آشوب ہے۔ ہر طرف افراتفری ہے۔ "Might is right" کے ظالمانہ اصول کے تحت طاقتور اقوام کمزوروں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے پوری طرح سرگرم ہیں۔اُن کی اس سرگرمی اور مہم جوئی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہورہا ہے۔ انسانیت سسک رہی ہے۔چشمِ فلک دیکھ رہی ہے کہ تہذیب، ترقی اور روشن خیالی کے اس دور میں محکوم اور بے بس اقوام کے بوڑھوں اور عورتوں کے ساتھ اُن کے بچوں کو بھی خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔ جدید دور کے جدید ذرائع ابلاغ کی بدولت ایسی صورتِ حال کس سے پوشیدہ رہ سکتی ہے! معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ظالموں کو ڈھیل تو دیتا ہے مگر اُس کے انتقام سے کوئی ظالم بچ نہیں سکتا۔

کسی نے کسی سے پوچھا تھا کہ عقل علم سے آتی ہے یا عمر گزرنے کے ساتھ؟ اس سوال پر بتانے والے نے حضور سید عالم محسنِ انسانیت محمد رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کا حوالہ دیا

Marfat.com

کہ ''رَاسُ الحِکْمَۃِ مَخَافَۃُ اللّٰہ ''یعنی دانائی کی بنیاد تو اللہ کا خوف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خوف کے بغیر تہذیب و شائستگی، حکمت و دانائی اور عقل و روشن خیالی کا ہر دعویٰ بے بنیاد ہے۔ جس کے دل سے اللہ کا خوف اُٹھ جائے اُس کی عقل و فکر میں آوارگی آجاتی ہے، پھر وہ حدود سے تجاوز کرتا ہے اور دوسروں کو تعصب اور دشمنی کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلتا ہے۔ نسل انسانی کے پھولوں کو روند کر گلشنِ ہستی کو ویران کرتا ہے۔ کاش کہ اُسے بصیرت کی روشنی ملی ہوتی!

□□□

دانائی کی بنیاد خوفِ خدا ہے!

Marfat.com

آغاز وانجام ـــــ لازم وملزوم

کائنات کا ایک نقطۂ آغاز تھا لہٰذا قانونِ فطرت کی رُو سے اِس کا انجام بھی ہے۔ آغاز اور انجام کا باہم لازم وملزوم تعلق ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر شے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے، جس میں لمحۂ فکریہ انسان کے لیے ہے۔ انسان ہی کو دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ وہ اپنے انجام کی فکر کرے، اس لیے کہ نباتات ہوں یا جمادات، حیوانات ہوں یا حشرات، دریا سمندر اور پہاڑ ہوں یا شمس وقمر اور نجوم، کوئی بھی شے آخرت میں جواب دہ نہیں ہے۔ صرف جن وانس جواب دہی اور محاسبے کے مرحلے سے گزریں گے۔ جو ایسا کٹھن مرحلہ بتایا گیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی۔

کچھ لوگوں نے تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوگا۔ انسان موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اُس کی ہڈیاں گل سڑ جاتی ہیں۔ ذرّہ ذرّہ بکھر جاتا ہے اور بس! پھر کہاں کی زندگی اور کیسا انجام! یہ خود فریبی ہے، فرار کی ناکام کوشش، مگر فرار ممکن نہیں۔ اس لیے کہ قاطع دلائل کی روشنی میں مرنے کے بعد کی زندگی اور انسان کا انجام طے شدہ حقیقت ہے۔ انسان لمحہ بہ لمحہ اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے، چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے۔

بہت ضروری ہے کہ انجام کے پیشِ نظر محتاط رویہ اختیار کیا جائے۔ بے راہ روی چھوڑ کر راہِ راست پر چلا جائے۔ دنیا میں یوں رہا جائے کہ یہ زندگی انجام کار مفید بن جائے۔ آخرت میں

Marfat.com

انسان کا انجام تو دنیوی زندگی ہی کے ردِعمل کا نام ہے۔ حسنِ کردار کی صورت میں خوش گوار اور بدعملی کے نتیجے میں تکلیف دہ اور ناگوار قسم کا انجام عین تقاضائے فطرت ہے۔

دینِ فطرت میں دونوں قسم کے انجام کی بھرپور وضاحت کر دی گئی ہے۔ یہ وضاحت جنت اور دوزخ کی صورت میں الہامی تعلیمات میں موجود ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ''اِنّ الابرار لفی نعیم واِنّ الفجّار لفی جحیم'' یعنی اچھے اور صالح لوگوں کا انجام جنت ہے جبکہ نافرمانوں کا دوزخ۔ ترغیب دلائی گئی ہے کہ انسان اچھے اعمال کے ذریعے اچھے انجام یعنی جنت کی طرف پیش قدمی کرے اور برے انجام سے بچنے کے لیے برائی سے بچے۔

قرآن میں دوزخ کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ ایسا بھیانک ہے کہ اُس کے تصور سے لرزا طاری ہوتا ہے۔ اہلِ دوزخ کا جو حال بیان کیا گیا ہے وہ انتہائی کرب انگیز اور عبرت ناک ہے۔ خبردار کیا گیا ہے کہ نافرمانوں کا انجام یعنی دوزخ انتہائی برا ٹھکانہ ہے۔ نافرمان جب اُس میں ڈالے جائیں گے تو نکلنے کی راہ نہ پائیں گے۔ دوزخ کی آگ اُن کے جسموں کو جلا ڈالے گی۔ موت وحیات کی کش مکش، نہ زندگی نہ موت۔ برے انجام والے یعنی اہلِ دوزخ جب پانی مانگیں گے تو پینے کے لیے اُنہی کے جسموں سے نکلنے والی پیپ دی جائے گی۔ دوزخ کو دیکھ کر لوگوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔ کافر آرزو کریں گے، کاش وہ فرماں بردار ہوتے! کاش ان کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تا کہ وہ فرمانبرداری کی زندگی گزار کر برے انجام سے محفوظ ہوسکیں! مگر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

یہ انجام ہے نافرمانی کا، قانون فطرت اور الہامی ہدایت سے بغاوت کا۔ کیا انسان اس سے بچنا نہیں چاہتا۔

لمحۂ فکریہ ہے! ایک شعوری اور ذمے دار مخلوق ہونے کے ناتے ضروری ہے کہ انسان اپنے انجام کی فکر کرتے ہوئے زندگی کی ترجیحات کا تعین کرے۔ فطرت کی پکار کو سمجھے۔ خواہشِ نفس کی بجائے اللہ کے حکم اور قانون کو ترجیح دے۔

کسی روز کافر آرزو کریں گے،

کاش وہ مسلمان ہوتے!

□□□

Marfat.com

جامع العبادات رُکنِ دین

دین اسلام کے پانچ ارکان میں سے حج بیت اللہ جامع العبادات رکنِ دین کہلاتا ہے جو کئی پہلوؤں سے قابلِ ذکر ہے۔ ارکانِ خمسہ کی ایک مجموعی حیثیت تو یہ ہے کہ یہ بنیادی فرائض ہیں اور اِن کی پابندی بہر صورت لازم ہے۔ جو جو رکن جس جس انداز سے فرض کیا گیا ہے اُس کی پابندی اُسی طرح لازم ہے۔ مثال کے طور پر نماز بلاتخصیص سب پر فرض ہے یعنی اہلِ ایمان پر۔ زکوٰۃ ان مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے جو صاحبِ نصاب ہوں۔ صوم یعنی روزے کی فرضیت صحت اور تندرستی کے ساتھ مشروط ہے جبکہ حج صاحبانِ استطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔

حج بیت اللہ کو جامع العبادات رکن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں کم وبیش دیگر تمام ارکان کی پابندی کا بھی اہتمام کروایا جاتا ہے۔ خواہ باجماعت نماز ہو یا دوسرے وظائف، مالی قربانی ہو یا والہانہ اظہار بندگی، وقت کی پابندی ہو یا مشقت کی زندگی، عمرہ و حج کے دوران یہ سب کچھ اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ انسان کچھ عرصے کے لیے دوسرے ہر قسم کے کاروبار حیات سے کنارہ کش ہو کر مسلسل عبادت وریاضت میں رہتا ہے اور بندگی میں مزہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حج بیت اللہ عالمِ اسلام کی مرکزیت کا مظہر ہے۔ دنیا بھر سے لاکھوں مسلمانوں کا حرمین الشریفین میں جمع ہونا اور مناسکِ حج ادا کرنا، ثابت کرتا ہے کہ ان کا قبلہ وکعبہ ایک ہے، وہی

Marfat.com

ان کا اصل مرکز اور پلیٹ فارم ہے جس کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی وجود کی بقاء وابستہ ہے۔ وہاں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل مل گئی ہو۔ خیر الامم یعنی امت محمدیہ کے اس عالم گیر فخر کا کوئی جواب نہیں۔ چودہ سو سال گزر گئے، فرزندانِ اسلام ہر سال پہلے سے بڑھ کر اپنے مرکز و محور کا طواف کر رہے ہیں۔ امت کی وحدت اور یک رنگی کا یہ عالم دیکھنے کو ملتا ہے کہ زبان و بیان، رنگ و نسل اور لباس وغیرہ کے بت پاش پاش ہو جاتے ہیں اور یہی تقاضا بھی ہے کہ:

؎ بتاں رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

حج کے لباس میں ملبوس عالمِ اسلام کا عظیم تر اجتماع اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی تفریق اور تضاد نہیں اور وقت آنے پر فروعی اختلافات کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

حج وحدتِ ملی اور اتحاد بین المسلمین کا علمبردار رکن ہے۔ ''واعتصموا بحبل اللّٰہ'' کی عملی تفسیر ہے۔ عالمِ اسلام کی عظمت و شوکت کا اظہار ہے۔ اسلامی تہذیب کا آفاقی شعار ہے۔ اس میں دنیا و آخرت کے فوائد ہی فوائد ہیں۔

حج بعثتِ محمدیؐ سے پہلے بھی ہوتا تھا مگر کل اور آج کے حج میں بہت فرق ہے۔ پیغمبرِ انقلاب نے جہاں زندگی کے دیگر تمام دھاروں کو بدل دیا وہاں حج کے آداب بھی از سرِ نو سکھائے۔ زمانۂ جاہلیت کی افراط و تفریط کو ختم کر دیا۔ تمام بری رسومات اور رزیلہ اخلاقیات کی جڑ کاٹ دی۔ حج کو ظاہری و باطنی پاکیزگی سے تعبیر کیا۔ اعلان عام کر دیا گیا کہ اب کوئی نجس وجود اللہ کے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ زمانۂ جاہلیت کے انداز میں کوئی حج نہیں کرے گا۔

اسلام نے نمود و نمائش اور غرور و تکبر کی نفی کر دی اور خبردار کیا کہ قبولیتِ حج خالص للّٰہیت کے جذبے کی بناء پر ہے۔ ''وَلِلّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع اِلَیہ سبیلاً'' استطاعت کے مفہوم میں سفرِ حج پر اُٹھنے والے اخراجات کے ساتھ ساتھ جسمانی قوت و طاقت بھی داخل ہے۔ بغیر کسی شرعی عذر یا مجبوری کے فریضۂ حج سے غفلت برتنا سخت ناپسند کیا گیا ہے، شدید قسم کی وعید آئی ہے کہ جو ایسا کرتا ہے اُس کا خاتمہ خواہ یہودیت پر ہو یا نصرانیت پر، اسلام سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ مقام فکر ہے! تجدید ایمان کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

ارکانِ اسلام میں سے ہر رکن کی ایک انفرادی حیثیت ہے۔ جامع العبادات رکن ہونے کے ناطے حج کی امتیازی فضیلت یہ بھی ہے کہ اس کی بدولت انسان گناہوں کی آلودگی سے یوں پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے اُس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ اہلِ ایمان کے لیے یہ سب سے بڑی خوش خبری ہے۔ گنہگاروں کے لیے امید کی روشنی ہے۔

□□□

؎ جو بندہ ہے تو مزہ بندگی میں پیدا کر
نہیں وہ بندہ جسے شوق ہو رہائی کا

Marfat.com

ہر بات سبق آموز ہے

دنیا واقعات سے عبارت ہے۔ بہت سے واقعات میں انسان کے لیے عبرت پذیری کا بہت سا سامان ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی ایک بڑی کمزوری ہے کہ بجائے سبق سیکھنے اور عبرت پکڑنے کے بڑے بڑے ہولناک واقعات کو بھی زندگی کا تسلسل اور محض ''Routine Matter'' سمجھتا ہے اور کوئی بھی سانحہ یا حادثہ اُس کے رویے اور فکر و عمل میں کم ہی کسی مثبت تبدیلی یا اصلاح کا باعث بنتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات تب آتی ہے جب اُفتاد اُس کے اپنے اُوپر آ پڑتی ہے۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کے ظلم و جبر اور جرائم کی پاداش میں بہت سے لوگ یا پوری بستی عذاب کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی! یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ ''کرے کوئی اور بھرے کوئی'' بات یہ ہے کہ ایسا ہونا نہ تو انہونی ہے اور نہ ہی خلافِ انصاف بات بلکہ فطری سی بات ہے کہ جب ظالم کو کھلی چھٹی مل جائے، اُسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو، وہ کسی پر جو بھی الزام لگائے اُسے درست مان لیا جائے، جس پر بھی ظلم کرنا چاہے کرتا چلا جائے۔ لوگ جانتے بوجھتے ظالم کو ظالم کہنے کے لیے تیار نہ ہوں، تو گویا وہ سب کے سب اُس ظلم میں برابر کے شریک سمجھے جائیں گے اور اُن سب کا قدرت کے انتقام کی لپیٹ میں آنا حیران کن نہیں۔

تاریخ نے ایسے بہت سے واقعات محفوظ کر رکھے ہیں جو فی زمانہ انسان کے لیے بہت

Marfat.com

سبق آموز ہیں۔ایسے واقعات کہ جن لوگوں نے بھی اجتماعی اور ملی مفادات کو نظر انداز کر کے کسی ظالم کے ظلم پر خاموشی اختیار کی یا اپنے نظریاتی تشخص کے برعکس ذاتی اور مادی مفاد کے لیے ظالم لوگوں کا ساتھ دیا، وہ بالآخر بدترین انجام سے دوچار ہوئے۔

خالقِ کائنات کے نظام میں بڑی لچک ہے۔انسان کے لیے معافی کی بہت گنجائش ہے۔ برائی اور ظلم کا ارتکاب کرنے والا زندگی میں جب بھی باز آجائے بشرطیکہ اُس کے سامنے موت رقص نہ کر رہی ہو، خالق ارض وسما اُسے بھی معاف کر دیتا ہے۔اسی طرح جب لوگ باز نہ آئیں تو اُس کے نظام میں یہ گنجائش بھی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ انسان جس شے کے مفید ہونے پر یقین رکھتا ہو وہ دیکھتے ہی دیکھتے تباہ کن صورت اختیار کر جائے اور انسان اُس کی لائی ہوئی تباہی کے آگے بے بس ہو کے رہ جائے اور خس وخاشاک کی طرح بہہ جائے۔

پانی ہی کی مثال لے لیں، پانی میں زندگی ہے۔ہر جاندار کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔پانی نہ ملے تو زندگی دم توڑ جاتی ہے۔لوگ بارش کے لیے دُعائیں کرتے ہیں، بارش ہو جائے تو جان میں جان آجاتی ہے، خوشی اور خوشحالی دیکھنے میں آتی ہے۔یہ تو بارش کی ضرورت، اہمیت اور افادیت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔لیکن یہی بارش جب رُکتی نہیں تو کیا ہوتا ہے؟ سیلاب آجاتا ہے اور بڑے بڑے منہ زور سیلابی ریلے ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔یہاں تک کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لینے والے بھی محفوظ نہیں رہتے۔

ہوا کی افادیت بھی مسلمہ ہے۔انسان ایک لمحے کے لیے بھی ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔مگر اِسی ہوا میں زہریلی گیسیں بھی ہیں۔یہی ہوا ہے کہ جو تند وتیز آندھیوں اور طوفانوں کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔مضبوط جڑوں والے درخت اکھڑ جاتے ہیں۔مکانوں کی چھتیں اور بھاری انجنوں والی گاڑیاں تک خزاں رسیدہ پتوں کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔

گرمی اور دھوپ کی اہمیت سے بھی سب واقف ہیں۔مگر یہی دھوپ جب لُو کی شکل اختیار کرتی ہے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔جاندار سائے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ نظام کائنات میں ہر شے قانونِ فطرت کی پابند ہے۔وہ اُسی طرح کام کر رہی ہے جیسے خالقِ کائنات چاہتا ہے۔سرِ مُو بھی انحرف نہیں، آزمائش تو انسان کی ہے کہ قوتِ فکر و فیصلہ کی حامل یہ مخلوق کیا کرتی ہے!

Marfat.com

ماضی فراموشی

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ماضی کو بھول جانا چاہیے اور صرف حال اور مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔لیکن یہ کوئی اتنی حقیقت پسندانہ سوچ نہیں۔ ماضی خواہ کیسا بھی ہو، اُس سے سبق حاصل کیے بغیر اصلاح احوال ممکن نہیں۔اسی لیے تو قرآن کہتا ہے: ''فَاعتَبِروا یااُولی الاَبصَار'' عقل والو! گزرے ہوئے حالات وواقعات سے سبق سیکھو۔

ماضی اگر اچھا نہیں، ناکامیوں اور محرومیوں سے عبارت ہے تو اس میں لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ناکامیوں کے اسباب ووجوہ کو تلاش کیا جائے اور ان کو دُور کرتے ہوئے 'من حیث القوم' نئے عزم کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کیا جائے۔اور اگر ماضی بہت اچھا ہے، مثبت اور تعمیری روایات سے عبارت ہے تو زہے نصیب! اور اُس میں سبق یہ ہے کہ اُن شاندار اور قابلِ فخر روایات کو زندہ رکھا جائے، اُن کے ساتھ وابستہ رہا جائے اور اُن کی روشنی اور راہنمائی میں اپنے حال واستقبال کا سفر طے کیا جائے۔اور اگر ہو سکے تو اپنے درخشندہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اپنے موجودہ انفرادی اور اجتماعی کردار کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔

بات یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی جڑیں اُس کے ماضی میں ہوتی ہیں۔وہیں سے اُس کی آبیاری ہوتی ہے۔اُسی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فکر اور احساس بیدار ہوتا ہے کہ اصلاح وفلاح کے لیے کونسے رجحانات اور رویوں کو جاری رکھنا چاہیے اور کون سے طور طریقوں اور رسم ورواج کو

Marfat.com

ترک کرنا ہے۔

انسانی تاریخ کا ایک بڑا حصّہ وہ بھی تو ہے جسے عرفِ عام میں دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے۔نوعیت کے اعتبار سے وہ دور تاریخ کا بہت بھیانک دور تھا جب ہر طرف کفر اور باطل کے گہرے سائے تھے۔انسان انسانیت سے نا آشنا اور حقیقت سے دُور، بہت دُور نکل چکا تھا۔مگر عبرت پذیری کے حوالے سے اُس دَور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ورنہ حق و باطل میں فرق نہیں ہو سکے گا۔اُسی کو سامنے رکھ کر تو یہ درسِ عبرت ملتا ہے کہ

ع تمیزِ آقا و بندہ فسادِ آدمیت ہے

اس لیے امنِ عالم کا تقاضا ہے کہ مساوات انسانی کو فروغ دیا جائے، امتیازی قوانین کا خاتمہ کیا جائے، محبت کو عام کیا جائے، اور استیصالی قوتوں کے خلاف مؤثر حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

اُسی دور کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ باطل پرستی کے باعث اِنسان کس طرح اپنے مقام سے گرتا ہے اور اپنے ہی ہاتھوں اپنی ذلت و رسوائی کا سامان کرتا ہے اور اس احساس کو تقویت ملتی ہے کہ کفر اور باطل پرستی کی ہر شکل کو رد کرنا ناگزیر ہے۔

قرآن حکیم بطورِ خاص انسان کے ماضی کا حوالہ دیتا ہے اور مختلف طرح سے خبردار کرتا ہے کہ جو کوئی اپنا مستقبل اپنے حق میں مفید اور بہتر دیکھنے کا خواہاں ہے، اسے چاہیے کہ عہدِ رفتہ کو سامنے رکھے اور اقوامِ عالم کے انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے حال کی اصلاح کرے۔

یہ زمانہ ہے جو عروج و زوال اور نشیب و فراز کی داستان ہے۔ماضی حال اور مستقبل اسی زمانے کا نام ہے۔اسی میں انسان بنتا بھی ہے اور بگڑتا بھی۔کائنات کی تاریخ میں زمانہ سب سے اہم ہے۔شاید اسی لیے خالقِ کائنات نے زمانے کی قسم اُٹھا کے اِنسان کو مستقبل کے نقصان سے خبردار کیا۔

"قسم ہے زمانے کی
انسان نقصان میں ہے!"

□□□

Marfat.com

ہے کہیں اِس کی مثال!

دُنیا میں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں مگر جس انداز سے انسان کو اسلام نے باوقار اور محترم مخلوق کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جس بلاغت کے ساتھ اِس کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالی ہے اُس کی مثال کسی بھی دوسرے مذہب کے اندر نہیں ملتی۔ کسی نے کہا کہ انسان تو پیدائشی خطا کار ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر محترم اور مکرّم ہے۔ اسے احسن تقویم پر پیدا کیا گیا ہے۔ گہنہ گاری اس کی فطرت میں نہیں۔ گردوپیش کے حالات وواقعات اِس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر شخص فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں ماحول کے اثرات کے تحت وہ کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔

کسی مذہب کی تعلیمات نے یہ بتایا کہ ذات پات کا بندھن پیدائشی طور پر انسان کے ساتھ ہے اور وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ برہمن، کھشتری، ویش یا شودر کے طور پر زندگی گزارے۔ اُس کی عزت و ذلت پیدائشی ہے۔ مگر اِسلام نے واضح کیا کہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔ بنیادی طور پر سب لوگ ایک جیسے ہیں۔ سب کو ایک جان سے پیدا کیا گیا تھا۔ رنگ ونسل اور جغرافیائی امتیازات کی ایسی کوئی حیثیت نہیں کہ اس بناء پر عزت وفضیلت یا ذلت ورسوائی کا کوئی معیار قائم کیا جائے۔ بلکہ یہ معیار تو تقویٰ پر مبنی ہے۔ انسانوں میں اگر کوئی درجہ بندی ہوسکتی ہے تو صرف اِس بناء پر کہ تقویٰ وطہارت اور تزکیۂ نفس میں کون آگے ہے۔

Marfat.com

کسی مذہب نے اِنسان کواس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ اُس کے لئے نروان یا نجات کا راستہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں ڈالے اور معاشرتی زندگی سے کنارہ کش ہو جائے۔ کسی جنگل کی راہ لے، ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عبادت کرے۔ مگر از رُوئے اسلام ایسا کرنے سے زندگی کا توازن بگڑ جائے گا۔ فطرت کے تقاضے مجروح ہوں گے۔ مقصد زندگی کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ بتایا گیا کہ حیات انسانی کا تعلق معاشرت سے ہے۔ باہمی حقوق و فرائض سے ہے۔ مادی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ذہنی و رُوحانی ارتقاء حاصل کرنے سے ہے۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے اور تقاضائے فطرت سے انحراف کا مطلب گمراہی ہے جبکہ گمراہی خرابی اور فساد پر منتج ہوتی ہے۔

کسی نے کہا کہ نسل انسانی کا طبقہ نسواں ایک نچلا اور بدترین طبقہ ہے۔ عورت محکوم ہے اور مرد کی ملکیت۔ اُس کا کوئی اِنسانی حق نہیں۔ چنانچہ اس طبقے کی تذلیل ہوتی رہی۔ خود ساختہ اِنسانی قوانین نے عورت کا ہر طرح سے استیصال کیا۔ اسے بدترین مخلوق قرار دے کر تمام انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ اس کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھا گیا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ حقوق اور آزادئ نسواں کے نام پر عورت کو 'exploit' کیا جانے لگا۔ حقوق کا لالچ دے کر اُسے ٹریڈ مارک بنا دیا گیا۔ مادہ پرستی کے نشے نے اُس کی حقیقت پسندانہ سوچ سلب کر لی۔ مگر اسلام نے نہ تو عورت کو کسی بھی طرح سے کمتر مخلوق سمجھا اور نہ ہی حقوق کی آڑ میں اُس کی عفت و عصمت پر کوئی حرف آنے دیا۔ دین فطرت ہی نے بتایا کہ نسلِ انسانی کے معرض وجود میں آنے میں مرد اور عورت دونوں کا یکساں کردار ہے۔ اِنسان ہونے کے ناتے اُس کے حقوق مردوں سے کم نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف حد بندیوں اور دائرۂ کار کا فرق ہے۔ عورت کا کوئی بھی ایسا حق نہیں جو اُسے دین فطرت نے نہ دیا ہو کہ جس کے نام پر اُسے اُس کے دائرۂ کار سے تجاوز کرنے پر مجبور ہونا پڑے۔

اِسلام ہی نے بتایا کہ ضابطہ اخلاق و حیاداری کا اطلاق مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ نیز حقوقِ انسانی میں کسی بھی شخص کا ایسا کوئی حق شامل نہیں جو اُصول حیاداری کے منافی ہو اور فحاشی و عریانی کی نمائندگی کرتا ہو۔ دینِ فطرت نے عورت ہو یا مرد اُسے اُس کے اِنسانی حوالے سے دعوتِ فکر دی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت پسند بننے کی کوشش کرے اور عارضی چکا چوند اور محض دنیوی فائدے سے بالاتر ہو کر دین فطرت کی روشنی میں اپنے کردار کا جائزہ لے۔

Marfat.com

نشاناتِ عبرت

ابلیس نے آدم کو حقیر سمجھا اور حکمِ خداوندی سے اِنکار کا اِرتکاب کر بیٹھا۔ نمرود آپے سے باہر ہوا اور خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ فرعون کے دماغ میں طاقت اور حکمرانی کا غرور سمایا اور وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا رب کہلوانے لگا۔ مگر مکافاتِ عمل دیکھئے کہ جب ابلیس کو حکم دیا گیا کہ نکل جا، تو مردود ہے اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہے تو اُس کا سارا تکبر خاک میں مل گیا اور اُسے معلوم ہو گیا کہ حقیقت میں حقیر کون ہے! نمرود، ابراہیمؑ کے پیش کردہ دلائل کے آگے بے بس ہوا، تو اُس کی ساری اکڑفوں نکل گئی، اُس پر اپنی حقیقت واضح ہو گئی اور فرعون جب سمندر کی منہ زور موجوں کی لپیٹ میں آیا تو اُس کا بھی نشہ ہرن ہو گیا اور وہ بھی جان گیا کہ اصل میں ربِّ اعلیٰ کون ہے؟

تاریخ میں ایسے اور بھی بہت سے کرداروں کی مثالیں موجود ہیں جو ہمیشہ طاغوت کی نمائندگی کرتے رہے اور حق وصداقت کو زخم لگاتے رہے۔ اور وہ یہ سب کچھ بہت اچھا سمجھ کر کرتے رہے۔ مگر بالآخر ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ دھڑام سے گرے اور نشانِ عبرت بن کے رہ گئے۔ بات یہ ہے کہ خوش فہمی اِنسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے اور آخرکار کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ وہ اپنی سمجھ کے دائرے کو اِس قدر تنگ کر لیتا ہے کہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا شاید اُس کے بس میں نہیں رہتا۔ یہ منفی رویہ بیماری کی شکل اختیار کر جاتا ہے جو خواہشِ نفس کی پیروی سے جنم لیتا ہے۔

قرآنِ حکیم انسان کو اصلاح کا دائمی پروگرام ہے۔ انسانی اصلاح کا انحصار اِس کی

Marfat.com

اِصلاحِ نفس پر ہے۔اس لئے نفسیاتی تجزیہ بہت ضروری ہے۔قرآنِ حکیم تربیتِ نفس کے حوالے سے نہایت اہم تجزیہ پیش کرتا ہے۔اس کی رُو سے ایمان لانے یا قبولیت حق کی صلاحیت کا تعلق دِل سے ہے۔

''افلا یتد برون القرآن اَم علٰی قلوبٍ اقفالُھا'' کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا اِن کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں! فرمایا: ''لھم قلوب لاّ یفقھون بھا'' یعنی اِن کے دل تو ہیں مگر سوچتے سمجھتے نہیں۔

قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے یا نہ لانے کا اِختیار انسان کو دیا گیا ہے۔اگر دِل سے صحیح کام لیا جائے تو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔قبولیت حق کے لیے دلوں کی فضا کا سازگار ہونا شرطِ اول ہے۔اگر یہ ہے تو یہ وہ متاع گراں بہا ہے جس کے آگے سب کچھ ہیچ ہے۔یہ سکونِ قلب ونظر کی دولت نایاب ہے۔'' الا بذکر اللّٰہ تطمئِنُ القلوب''

اور اگر ایسا نہیں تو دل قبولیت حق کی صلاحیت سے محروم رہ جاتے ہیں، آوارگیٔ فکر انسان کو بے راہ رو، خودسر اور خود فریب بنا دیتی ہے۔اُس کے رویے اور معیار بدل جاتے ہیں اور وہ ایسے ایسے اصول اور مفہوم وضع کرتا ہے جو از روئے فطرت وحقیقت درست نہیں ہوتے۔یہ کیفیت بیمار دل کی علامت ہے۔بالفاظ قرآن: ''ختم اللّٰہ علٰی قلوبھم'' اور ''کذٰلك یطبعَ اللّٰہ علٰی قلوبِ الکافرین'' گویا جو شخص اپنی صلاحیتوں سے صحیح استفادہ نہ کرنا چاہے اُس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔اور اسے ایمان اور حقیقت پسندی نصیب نہیں ہوتی۔چنانچہ خبردار رہنے کی ضرورت ہے کہ:

؎ دِلِ مردہ دِل نہیں ہے اِسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

انسانی حوالے سے دیکھا جائے تو اِس سے بڑھ کر تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اِنسان اپنے اصل مقام و مرتبے سے گر جائے جو ممتاز و منفرد ہے۔ایک برتر مخلوق ہوتے ہوئے خود ہی اپنی توہین کا مرتکب ہو اور اپنی ذلت و رسوائی کا سامان کر لے۔

قرآنِ حکیم اِنسان کی ہر قسم کی خوش فہمی اور خود فریبی کو بے نقاب کرتا ہے۔ارشاد فرمایا گیا، اے نبی ﷺ! لوگوں سے کہہ دو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ جو لوگ اعمال کے لحاظ سے بڑے نقصان

Marfat.com

میں ہیں۔ وہ لوگ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی سعیٔ عمل برباد ہوگئی لیکن وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ تو اچھے کام کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اُس کے سامنے پیش ہونے کی حقیقت کا اِنکار کیا تو اِن کے اعمال برباد ہوگئے اور ہم قیامت کے دن ان کے لئے کچھ بھی وزن قائم نہیں کریں گے۔ اِن کی سزا جہنم ہے۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں اور رسولوں کا مذاق اُڑایا۔

اِنسان کے زاویۂ نگاہ کو درست کرنے کے لئے قرآنِ حکیم مختلف مقامات پر اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ ہر شے کی حقیقت کا حقیقی علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ انسان جب تک علمِ الٰہی یعنی قانونِ فطرت کی روشنی میں اپنی راہ کا تعین نہیں کرتا منزلِ مقصود سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ تاریخ پیشِ نظر رہنی چاہیے اور نشاناتِ عبرت پر غور کرنا چاہیے۔

□□□

جو لوگ طاغوت کی پیروی کرتے رہے

نشاناتِ عبرت بن کے رہ گئے

Marfat.com

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا!

ایجادات کی تاریخ میں پہیہ انسان کی قدیم ترین ایجاد ہے۔ براہِ راست یا بالواسطہ یہ ایجاد ہر مشین میں استعمال ہوتی ہے۔ ہر چھوٹی بڑی گاڑی اور مشین پہیے سے چلتی ہے۔ سفر اور بار برداری کی ضرورت کے پیش نظر انسان نے سادہ سے چھکڑے سے شروع ہو کر وقت کے ساتھ ساتھ ایک سے بڑھ کر ایک گاڑی بنالی۔ برسوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ گاڑی کو پر لگا کر اُونچی فضاؤں میں اڑا دیا گیا جسے ہوائی جہاز کہا گیا۔ یہ انسان کی فکر و جستجو کا ثمر ہے کہ بہت بلندیوں میں اڑتا ہے، لمحوں میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ یہ اِس کا گویا کمال مہارت ہے۔ وہ چاند پر بھی قدم رکھ چکا اور اب اُس سے بھی آگے کا سفر پیش نظر ہے۔

انسان نے سمندروں پر راج کیا، پانیوں کو چیر ڈالا، منہ زور موجوں کو رام کیا، ٹنوں وزنی بحری جہازوں کو سطحِ آب پر رواں دواں کر دیا۔ سمندروں کی گہرائیوں میں کُود گیا اور اپنا لوہا منوالیا۔ زرعی سائنس میں ترقی کی اور بنجر زمینوں کو آباد کر لیا۔ زرعی اجناس کی نئی نئی اقسام ایجاد کیں، فصلوں کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ انسان نے طب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور باقاعدہ میڈیکل سائنس معرضِ وجود میں آئی۔ خطرناک اور لاعلاج بیماریوں پر زیادہ مؤثر انداز میں قابو پایا جانے لگا۔ سرجری میں جدید جہات سامنے آئیں۔ بیماریوں کی تشخیص کے نت نئے انداز سامنے آئے۔ انسان کی کارکردگی کو معاشرے میں بہت پذیرائی ملی۔

Marfat.com

انسان نے فنِ عمارت گری میں طبع آزمائی کی تو اس فن کی الگ تاریخ رقم ہو گئی۔ کچے گھروں کی بجائے پختہ عمارتیں بنیں۔ مختلف دیدہ زیب نقشوں کے تحت فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ سوسو منزلہ سے بھی زیادہ اونچی عمارتیں فنِ تعمیر کی تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ انسان کے اس طرح کے کارنامے پچھلی چند صدیوں میں زیادہ پیش رفت کے ساتھ سامنے آئے اور روز افزوں ترقی کے ساتھ سفر پزیر ہیں۔

یہ انسان کا اعزاز و امتیاز ہے کہ اس نے بہت کچھ کیا۔ جوہر سے جوہری توانائی کا حصول ممکن بنایا اور آج پوری دنیا میں ایٹمی ٹیکنالوجی کی دھوم ہے۔ جوہری توانائی کو دفاعی اور معاشی لحاظ سے بہت ضروری قرار دیا جاتا ہے اور ہر ملک اس کے حصول کا خواہاں ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ طاقتور اور خوش حال بن سکے۔

انسان کی میڈیا کے میدان میں ترقی بھی زبان زدِ عام ہے جو کسی تفصیلی تعارف کا محتاج عنوان نہیں۔ آج کے ذرائع ابلاغ بہت طاقتور اور موثر ہیں۔ میڈیا کی تیز رفتار ترقی کی بدولت اقوامِ عالم ایک دوسری کے بہت قریب آ گئیں۔ دنیا ایک گلوبل ویلیج کی شکل اختیار کر گئی۔ ترقی کا یہ عمل ہمہ جہت ہے جو رواں دواں ہے۔ اس حوالے سے انسان کی ہر کوشش قابلِ تحسین ہے۔

تاہم خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے! انسان ہواؤں میں تو بہت اونچا اُڑا، ستاروں پر کمندیں ڈالیں، چاند کو چھو آیا۔ مگر نجانے کیوں! لوگوں کو زمین پر مل جل کر رہنا نہ آیا۔ انسان مجموعی طور پر معاشرے کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔ معاشرے کی اخلاقی قدروں کو فروغ نہ دے سکا۔ حالانکہ اسے تو زمین پر رہنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

انسان نے سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے پانیوں کی گہرائیوں کا کھوج تو لگا لیا مگر یہ اپنے دل اور ضمیر کے بحرِ بے کراں میں جھانکنے سے قاصر رہا۔ دل و دماغ کو ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہا۔ زرعی تحقیقات کی بدولت فصلوں کی پیداوار تو بڑھی مگر غریب طبقہ موجود رہا جو غربت کے منحوس چکر سے نہ نکل سکا۔ انسان نے سیم زدہ اور مردہ زمینوں کو تو زندہ کر لیا مگر اسے دل مردہ کو زندہ کرنے کا خیال نہ آیا۔ مادہ پرستی کی دوڑ نے احساس مروت کو کچل کے رکھ دیا۔ اعلیٰ انسانی قدریں دُھندلا

Marfat.com

گئیں۔ فن عمارت گری میں کمال حاصل کر لیا، خوبصورت گھر بنائے مگر یہ نہ سوچا کہ گھر اور خاندانی نظام کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ جوہر سے جوہری توانائی تک کا سفر طے کر لیا مگر اس سے انسانی ترقی اور بہبود کی بجائے انسانی جانوں کو لقمۂ اجل بنا دیا گیا۔

اقبالؒ نے درست ہی تو کہا تھا کہ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

□□□

Marfat.com

اے مکہ! تو مجھے بہت عزیز ہے!

ہر طرح سے پریشان کرنے کے باوجود جب دشمن کو مایوسی ہوئی۔ حتیٰ کہ مقاطعہ کرنے کا اقدام بھی ناکام رہا اور بڑی سے بڑی پیش کش بھی ٹھکرا دی گئی اور کسی بھی صورت میں اصولی موقف سے باز نہ کیا جاسکا تو اُس نے قتل کا منصوبہ ترتیب دیا۔ دشمن کے لیے بظاہر یہ کام آسان مگر حقیقت میں انتہائی دشوار تھا۔ اس لئے کہ یہ کام کسی ایک شخص کے ذمے نہیں لگایا جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی ایک شخص اس پر آمادہ ہو سکتا تھا، ورنہ اُسے قبائلی مخالفت اور انتقام کے ایسے شدید طوفان کا سامنا کرنا پڑتا جس کی تاب نہ لائی جاسکتی تھی۔ کیونکہ شدید دشمنی کے باوجود دشمن حقیقت کو سمجھتا تھا اور بچہ بچہ جانتا تھا کہ پورے عرب میں الصادق اور الامین کون ہے؟ اور معاشرے میں اُس کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ یہ تو اُن کا نسلی تفاخر اور تعصب تھا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے جاہلی طور طریقوں سے باہر نہیں آنا چاہتے تھے ورنہ کیا وہ سمجھتے نہیں تھے کہ سب مورتیاں مجسّمے بے جان ہیں اور کسی کو نفع ونقصان پہنچانے سے عاری! اصل میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے فرسودہ اور غیر فطری سماجی نظام کو دھچکا لگے اور سرداریوں پر زد پڑے۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کے خلاف محاذ آرائی کی جسے انہوں نے خود الصادق والامین کے خطابات دے رکھے تھے۔ طے یہ پایا کہ اقدامِ قتل میں ہر قبیلے کے لوگ شامل ہوں تاکہ قریش کے انتقام کا نشانہ کوئی ایک قبیلہ نہ بنے۔ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ

Marfat.com

کرلیا جائے اور جیسے ہی صبح کو نماز کے لیے باہر آئیں تو اجتماعی حملہ کر کے کام تمام کر دیا جائے۔

یہ منصوبہ تھا کفار مکہ کا جس کے تحت منتخب مسلح افراد نے ساری رات حرم نبوی ﷺ کا محاصرہ کیے رکھا اور دوسری طرف اللہ کی حکمت بالغہ! جس کے تحت نبوی مشن ایک نئے موڑ سے ہمکنار ہونے کو تھا۔ تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی کفار کی ساری پلاننگ کا علم ہو چکا تھا۔ اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم آ چکا تھا۔ اپنی نوعیت کا واحد تاریخ ساز مرحلہ! یہی شبِ ہجرت تھی جس کے بعد نیا دور تھا اور نئے تقاضے۔

ایک طرف کفار کی بدترین اسلام دشمنی اور دوسری طرف ان کا محمد ﷺ کی ذات پر بھروسے کا یہ عالم کہ اپنی امانتیں بھی انہی کے پاس رکھی ہوئی ہیں۔ عجیب عالم ہے کہ وہ اُسی شخص کو مار دینا چاہتے ہیں جس سے زیادہ ان کے نزدیک اور کوئی امانتدار اور سچا بھی نہیں۔

بہر حال اللہ کا نبی ﷺ دشمن کے محاصرے میں ہے۔ جان کا خطرہ لحہ بہ لحہ بڑھ رہا ہے مگر اس خوف ناک اور نازک صورتِ حال میں بھی رسول اللہ ﷺ کی اوّلین ترجیح انہی دشمنوں کی رکھی ہوئی امانتوں کی حفاظت اور پاسداری کا اہتمام ہے۔

سفر ہجرت کا آغاز ہوا جو قدم بہ قدم معجزات سے عبارت ہے۔ رسول اللہ ﷺ قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے گھر سے نکلتے ہیں۔ ہتھیار بند کفار کا دستہ مذموم ارادے سے موجود ہے۔ مگر کرشمۂ قدرت دیکھیے کہ ان میں سے کسی کو شک بھی نہ گزرا کہ گھر سے کوئی نکلا ہے! جب کافی دیر ہو چکی تو محاصرین سوچنے پر مجبور ہوئے کہ آخر کیا وجہ ہے! محمد ﷺ آج نماز کے لئے گھر سے کیوں نہیں نکلے۔ بالآخر وہ اندر گھس گئے اور یہ جان کر اُن کے ہوش اڑ گئے کہ وہ جس مقصد کے لیے رات بھر جاگتے رہے وہ مقصد تو فوت ہو گیا، کفِ افسوس مل کے رہ گئے۔ منہ مانگے انعام کا لالچ دے کر لوگوں کو پیچھے دوڑایا کہ محمد ﷺ کو پکڑ کر لائیں۔

اُدھر رسول اللہ ﷺ مکہ سے باہر نکلے۔ شہر پر ایک نظر دوڑائی اور فرطِ جذبات میں فرمایا۔ اے مکہ! تو مجھے بہت عزیز ہے۔ لیکن تیرے رہنے والے مجھے یہاں نہیں رہنے دیتے اور پھر اپنے صدیق کے ہمراہ یثرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ یثرب مدینۃ النبی کہلایا اور دنیا کی پہلی اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آئی۔

Marfat.com

ماحول کا اثر

فرد اور معاشرہ باہم لازم وملزوم ہیں۔ دونوں کو کسی بھی صورت میں الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے اور معاشرے میں افراد ہی کا کردار زیر بحث آتا ہے۔ سماجی تعمیر یا تخریب کا عمل افراد کے کردار اور رویوں کا مرہونِ منت ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اگر افراد نہ ہوں تو معاشرے کا تصور بے معنی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد ہی معاشرتی زندگی کا قیام تھا "ولکم فی الارض مستقر" اس مقصد کی کامیابی قانون فطرت کی پیروی میں مضمر قرار پائی۔

انسان سے فرمایا گیا کہ تمہارا ٹھکانا زمین پر ہے۔ نیز فرمایا گیا "میری طرف سے جب بھی تمہارے پاس ہدایت آئے تو جن لوگوں نے میری ہدایت کی پیروی کی اُنہیں کوئی خوف اور پریشانی نہ ہوگی۔ عظیم تر معاشرتی فلاح کا یہ مقصد الہامی ہدایات کی روشنی میں عائد ہونے والی معاشرتی ذمے داریوں کے شعوری احساس کی پاسداری سے عبارت ہوا۔

جب کوئی معاشرہ تشکیل پا جاتا ہے، تو اُس کا ایک اجتماعی تاثر اُبھرتا ہے، وہ جیسا بھی ہو۔ کسی بھی ماحول میں پیدا ہونے والا فرد اُس ماحول کے اثرات قبول کئے بغیر نہیں رہتا۔ اُس کے

Marfat.com

کردار اور رہن سہن میں اُس خاص ماحول کے اثرات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ وہ نکتہ نظر ہے جس کی رُو سے کہا جاسکتا ہے کہ افراد کے کردار کی تخلیق میں معاشرے اور ماحول کا دخل ہے۔ اور یہ بھی فطری بات ہے جس کی وضاحت حدیث نبوی ﷺ میں یوں ملتی ہے کہ ہر نومولود بنیادی طور پر فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اُس کے والدین اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ گویا انسان ہے تو انسان مگر اُس کا بننا یا بگڑنا معاشرے کے زیراثر ہے۔ اسی لئے یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں کوئی تو اچھی عادات اپنا لیتا ہے اور کوئی اس کے برعکس بُری عادات کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی کو دوسروں سے محبت اور اپنائیت ملتی ہے تو کسی کو نفرت۔ کسی کا نام دنیا میں اچھائی اور خوش گوار احساس کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے تو کوئی تلخ یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ جس کو جیسا ماحول میسر آیا وہ ویسا ہی بن گیا۔ یہ معاشرتی تربیت کا اثر ہے۔

یہ اثر اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے زائل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مثال جسم میں خون کی سی ہے جو صالح بھی ہوسکتا ہے اور فاسد بھی۔ انسان جب دنیا میں آتا ہے، آنکھ کھولتا ہے تو آہستہ آہستہ اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتا ہے۔ ایک غیر محسوس انداز میں، لاشعوری طور پر ماحول کو جذب کرتا ہے جو اُس کی لوحِ ذہن پر نقش ہوتا چلا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی عملی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے۔

جس نے علمی ماحول میں جنم لیا وہ علم و عرفان کے راستے پر چلا۔ جسے سیاسی ماحول میسر آیا وہ میدان سیاست میں اُتر گیا۔ جسے جاہلی ماحول ملا وہ جہالت کے اثرات سے نہ بچ سکا۔ الا ماشاء اللہ! جسے قدرت خود chanalise کرے اُس کا معاملہ الگ ہے۔ اچھے ماحول کے باوجود کسی میں خرابی کا پیدا ہو جانا بھی خارج از امکان نہیں۔ اس لئے کہ ''یخرِج الحیَّ مِن المیت ویخرج المیت من الحی'' یعنی یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کو پیدا کر دیتا ہے۔

تاہم بحیثیت مجموعی فطری طور پر فرد کے حسن و خوبی کا کریڈٹ معاشرے اور ماحول کو بھی جاتا ہے اور اسی طرح برائی یا خرابی کی صورت میں بھی ماحول پر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

□□□

Marfat.com

جاہلوں سے اعراض

دنیا میں انسان کو مختلف طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اُن میں چھوٹے بھی ہوتے ہیں بڑے بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ افسر بھی اور ماتحت بھی، دوست بھی اور دشمن بھی، عالم بھی اور جاہل بھی۔ معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے کہ انسان جس سے بھی ملے، جس سے بھی اُس کا واسطہ پڑے اُس کے حسبِ حال اپنے رویے میں اعتدال اور وقار قائم رکھے۔ کسی بڑے سے ملے تو اُس کا احترام کرے، اپنے سے چھوٹوں پر شفقت سے پیش آئے، ماتحتوں سے نرمی کرے، دشمن کے ساتھ بھی وقار سے پیش آئے۔ علماء واساتذہ کرام کی قدر کرے، اُن سے استفادہ کرے اور جاہلوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اُن سے بحث وتکرار سے گریز کرے۔

دینِ فطرت ہونے کے ناتے اسلام انسان کے لیے ہر طرح سے مکمل ضابطۂ زندگی ہے۔ دینِ اسلام کا پیش کردہ نظام اخلاق انتہائی جامع اور عمدہ ہے جو زندگی کی جزئیات سے لے کر کلیات تک میں باوقار انقلاب برپا کرتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ پرامن، خوشگوار اور باہمی عزت واحترام سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ انسان کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس میں انسانیت ہو جو اصل انسانی جوہر ہے۔ اگر اس حوالے سے انسانی زاویۂ فکر درست ہو تو اس میں اعلیٰ وارفع اوصاف و اطوار پیدا ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم عباد الرحمٰن کی بہت سی عمدہ صفات کا تذکرہ کرتا ہے جن سے اُن کی پہچان

Marfat.com

ہوتی ہے۔اُن میں سے ایک صفت جاہلوں سے اعراض اور صرفِ نظر کرنا ہے۔ارشاد فرمایا گیا:

''وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هَوناًوَّ اِذَا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاماً''رحمٰن یعنی اللہ ذوالجلال کے بندے وہ ہیں جو عاجزی سے زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے جاہلانہ باتیں کرتے ہیں تو وہ انہیں سلام کہہ دیتے ہیں یعنی ان کے منہ نہیں لگتے،اُن سے بحث نہیں کرتے بلکہ اُن سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جہالت انسانی کردار کے لیے سب سے زیادہ خطرناک رجحان ہے جس سے بہت سی نفسیاتی اور معاشرتی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ آمیزی نہیں کہ کفر وشرک بھی جہالت ہی کی پیداوار ہے۔چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ کفر اور باطل پرستی کی وجہ سے ہی دور جاہلیت کہلایا۔یعنی نسل در نسل انبیائے کرام ﷺ کی تعلیمات کو فراموش کیا گیا اور اس طرح سے پسِ پُشت ڈال دیا گیا کہ آنے والی نسلیں اُن سے بالکل بے خبر اور لاعلم ہو کے رہ گئیں اور جاہلانہ رویے پروان چڑھتے گئے۔لوگ علم حقیقت سے دور اور جہالت سے قریب تر ہوتے چلے گئے اور معاشرہ گمراہی کا گڑھ بن گیا۔مگر بالآخر علم حقیقت ہی کام آیا۔

واضح رہے کہ''قالوا سلاماً''یعنی جاہلوں سے صرفِ نظر کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہیں دعوتِ حق نہ دی جائے اور اُن کی اصلاح نہ کی جائے۔بلکہ یہ اِعراض بھی اصلاح کے نکتۂ نظر سے ہے۔دینِ اسلام کا تو اول و آخر مقصد ہی اِنسانی کردار کی اِصلاح ہے۔لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت کی روشنی میں لانا ہے۔

□□□

Marfat.com

فیصلہ کُن ہدایت

ہدایت، انسان کی فطری اور بنیادی ضرورت ہے۔ یہ انسان کے شعوری اور بہترین مخلوق ہونے کا تقاضا ہے۔ ہدایت کے بغیر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ کچھ بھی کرنے کے لیے، کہیں بھی جانے کے لیے رہنمائی بہر حال ضروری ہوتی ہے تا کہ کام اچھا ہو، اچھے طریقے سے ہو اور مطلوبہ منزل تک رسائی ممکن ہو۔ ہر شے کا مقصد طے شدہ ہے۔ چاقو چھری کا بھی ایک مقصد ہے اور قلم وقرطاس کا بھی۔ رہنمائی چاہیے کہ وہ کیا مقصد ہے اور حصولِ مقصد کیونکر ممکن ہے؟ ورنہ کسی بھی شے کے غلط اور نامناسب استعمال کا قوی احتمال ہے۔

انسان کو بتایا گیا ہے کہ اس کا ایک باقاعدہ مقصدِ وجود ہے جو بہت منفرد ہے۔ بتایا گیا کہ تمہارے لیے زمین جائے قرار ہے۔ وہ تمہارا ٹھکانہ ہے مگر ایک خاص دورانیے کے لیے کہ جس میں تمہیں فائدہ اٹھانا ہوگا۔ زمین پر رہ کر فائدہ اُٹھانا، اس فائدے سے مراد ہمہ جہت فائدہ ہے۔ گویا زندگی گزرے اور ہر پہلو سے کامیاب گزرے جو اِنسان کے حق میں زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو۔ یہ انسان کا مقصدِ وجود ہے جس کی وضاحت اِنسان کو زمین پر بھیجنے کے ساتھ ہی کر دی گئی تھی۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کیسے ہوگا؟ اس وسیع تر اور ہمہ جہت فائدے کی بات اِنسان کی سمجھ میں کیسے آئے گی؟ نفع ونقصان اور حلال وحرام میں تمیز کون بتائے گا؟ یعنی ایسی ہدایت جو نسلِ انسانی

Marfat.com

کی فطری اور بنیادی ضرورت ہے کون فراہم کرے گا؟ جو انسان کو ہمہ جہت فائدے اور متاع سے ہمکنار کر دے۔ اسے انسان کی عظیم تر خوش بختی کہیے کہ خالقِ ارض وسما، مالک الملک ذات نے اِسے کبھی بھی الجھن میں نہیں رکھا۔ آزمائش میں ضرور ڈالا مگر اس میں پورا اُترنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ قوت واستعداد سے زیادہ بوجھ کبھی نہ ڈالا۔ اُس نے اِنسان کے تمام تر مادی اور روحانی، ذہنی اور جسمانی تقاضوں اور لوازمات کو خوب خوب ملحوظِ خاطر رکھا۔ انسان کے لیے رُشد وہدایت کا وہ اہتمام کیا جو تمام جن وملک اور انسان مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہ یہ قوت اور اختیار ہی خالقِ برحق کا ہے کہ وہ مخلوق کے تقاضوں کو جانے اور اس کے لیے بہترین ہدایت کا اہتمام کرے۔

چنانچہ فطری ضابطۂ ہدایت ہی اصل میں وہ پیغامِ ہدایت ہے جس میں انسان کے مقصدِ وجود اور اُس کے حصول کے حوالے سے پوری پوری صلاحیت ہے۔ اِسی ضابطۂ ہدایت کا دوسرا نام دینِ فطرت ہے جو اللہ کا طے کردہ ضابطۂ حیات اور منتخب کردہ دین ہے۔ اللہ نے اس کا نام ’اِسلام‘ رکھا جس کے ساتھ پوری نسلِ انسانی کے حقیقی فائدے اور ابدی فلاح کو وابستہ کیا گیا۔ ہر دور کے انسان کے لیے یہی واحد راستہ ہے جو اُس کی فطری اور بنیادی ضرورتِ ہدایت کو پورا کرتا ہے۔ اس سے انحراف گمراہی ہے۔ دین فطرت خبردار کرتا ہے کہ ہدایت کے درست اور صحیح تر مفہوم پر پورا اُترنے والا ضابطۂ ہدایت صرف اللہ کا ہے۔ ’’قل اِنّ هُدَى اللّٰه هُو الهُدىٰ‘‘ خبردار کرتا ہے کہ فوز وفلاح کا حقیقی راز اِسی میں مضمر ہے۔ بصورتِ دیگر شرمندگی ہے، ذلت ورسوائی ہے۔ ’’فَاِمّا ياتينّكم مِنّى هُدىً فمن تبع هُدَاىَ فَلَا خوفٌ عَلَيهم ولا هُم يحزنونo وَالّذين كفروا و كذّبوا بِاٰيٰتِنَا اولٰئك اصحٰب النار هم فِيها خٰلِدُون‘‘

دینِ فطرت ہی وہ ضابطۂ رشد وہدایت ہے جس سے نسلِ انسانی کو آگاہ کرنے کے لیے اللہ ذوالجلال والاکرام نے تاریخ انسانی کے ہر دور میں ہر قوم کی طرف انبیائے کرامؑ مبعوث کیے۔ سب نبیوں کا مقصدِ بعثت ایک رہا، مشن ایک رہا۔ یہاں تک کہ الہامی سلسلۂ رشد وہدایت مشیتِ ایزدی کے مطابق مرحلۂ تکمیل میں داخل ہو گیا۔ اللہ کا ضابطۂ ہدایت یعنی دینِ فطرت بعثتِ محمدیؐ کی شکل میں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا جو ہدایت کی روشنی کا وہ مینار اور فوز وفلاح کا وہ معیار ہے جو ہدایت کے دیگر تمام مرحلوں اور مذاہب پر غالب ہونے کے لیے ہے۔ یہ فیصلہ اللہ کا ہے کسی اور کا نہیں۔

□□□

Marfat.com

نماز کے دوران فون کی گھنٹی

دینِ اسلام میں جن باتوں کو ارکان اسلام کہا گیا ہے ان میں ایک نماز ہے۔ نماز کے لیے قرآن میں صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی دعا کرنا، برکت مانگنا اور یاد کرنا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں نماز ایک خاص انداز عبادت ہے جس کی فرضیت و اہمیت اور ترتیب وتشکیل کی مکمل وضاحت قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ اسلامی کردار کی تشکیل میں اس کی اہمیت بنیادی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "عماد الدین" یعنی دین کا ستون قرار دیا ہے۔ ارشاد گرامی اپنے اندر گہرا فلسفہ لیے ہوئے ہے، جسے سمجھنا ہمارے لیے اشد ضروری ہے۔

نماز کے بغیر اسلامی تشخص بے معنی و بے بنیاد ہے، جس طرح کہ ستونوں کے بغیر عمارت کا مفہوم بے معنی ہے۔ نماز صرف ظاہری قیام ورکوع وسجود کا نام نہیں بلکہ اِسے جو ستون قرار دیا گیا ہے تو اس کے ساتھ ان مقاصد کا حصول وابستہ کیا گیا ہے جو اصل میں انسان کے مقاصدِ حیات ہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے نماز پوری توجہ اور انہماک کی متقاضی ہے۔ جس کے بغیر اس رکن کا مفہوم، فلسفہ اور حق ادا نہیں ہوسکتا۔ نماز انسان کی طرف سے معبود برحق اللہ وحدہ لاشریک ذوالجلال والاکرام کے حضور اس طرح سر تسلیم خم کردینے کا نام ہے کہ اس دوران اس کی توجہ کسی اور

Marfat.com

طرف نہ جائے بلکہ تمام تر توجہ کا مرکز صرف اور صرف رب کائنات کی ذات رہے۔

نماز میں مکمل توجہ، انہماک اور خشوع وخضوع پیدا کرنا بہت اہم، نازک اور حساس مرحلہ ہے جس کے لیے کچھ لوازمات ہیں جن کا اہتمام ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تو ہدایت نبویؐ کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ حُسنِ عبادت یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے گویا عابد اپنے معبودِ حقیقی کو دیکھ رہا ہے یا اس احساس کے تحت کہ اللہ تو ہر کسی کو ہر آن دیکھ ہی رہا ہے۔ اس ہدایت میں یہی فلسفہ مضمر ہے کہ نماز زیادہ سے زیادہ توجہ سے ادا ہو سکے۔

دوسرے اُن باتوں سے پرہیز لازم ہے جو نماز میں خلل انداز ہوتی ہیں اور خشوع وخضوع کے حصول میں رکاوٹ بنتی ہیں مثلاً نماز کے دوران کسی کے سلام کا جواب نہ دیا جائے، نہ اِدھر اُدھر دیکھا جائے اور نہ ہی اِشارے سے بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسا کچھ کرنے سے توجہ یقیناً بٹ جاتی ہے اور نماز کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

وسیع تر مقصد کے پیشِ نظر ہی یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ دوسرے لوگ نمازی کے آگے سے نہ گزریں، بلند آواز میں اُس کے پاس باتیں نہ کریں۔ شور شرابہ تو سختی سے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ نماز کی حساسیت، حُسنِ عبادت اور بندگی کا لازمی تقاضا ہے تاکہ نماز میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا قرب اور اُس کی رضا نصیب ہو سکے۔ اس کا انحصار خلوص نیت اور نماز کے حوالے سے شعوری احساس پر ہے اور اس بات پر بھی کہ نماز رسماً ادا کی جا رہی ہے یا لازمی فرض کے طور پر۔

آج کا انسان کاروبارِ زندگی اور ایجادات کی دنیا میں اس قدر کھو کر رہ گیا ہے کہ اس لازمی فرض کو بھی رسم کے طور پر ادا کیا جاتا ہے، گویا:

ع رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی

سائنسی ترقی اور نت نئی ایجادات کے ساتھ ہی جہاں لوگوں کے طور طریقے بدل گئے ہیں وہاں فرائض کی ادائیگی کے انداز بھی بدل کر رہ گئے ہیں۔ تازہ ترین ایجادات میں سے موبائل فون ہے جس کی بدولت ٹیلی کمیونی کیشن کی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب آیا ہے۔ اس قدر سہولت کہ اب تو کوئی فاصلہ ہی نہیں رہا۔ اِس قدر عام کہ ایک ایک کے پاس کئی کئی سیٹ! مگر اس سہولت کا صحیح کم اور غلط استعمال زیادہ ہے۔ موبائل فون ہر وقت اور ہر جگہ بجتا ہے۔ درس گاہوں اور کلاس رومز میں بھی بند نہیں ہوتا۔ اور تو اور مساجد کا تقدس بھی اس کلچر کے تحت پامال ہو رہا ہے۔ نماز کے دوران

Marfat.com

موبائل فون لوگوں کی توجہ اور انہاک پر اثر انداز ہوتے ہیں۔مگر روشنی سے محروم ترقی یافتہ انسان کے دل ودماغ اس احساس سے بالکل عاری ہیں۔نمازی کی جیب میں فون کی گھنٹیاں بجنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی خود شور مچا کر اپنی اور دوسروں کی نماز خراب کردے۔اگر چہ موبائل فون وقت کی ضرورت بن گیا ہے۔تاہم کم از کم اتنا تو کرلیا جائے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اس کو بند کر دیا جائے۔غالباً یہ بات اتنی ہی ضروری ہے، جتنا نماز کے لیے وضو!

□□□

حُسنِ عبادت تو یہ ہے کہ
تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے
گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے۔اگر تو نہیں دیکھتا
تو وہ (اللہ) تو تجھے دیکھتا ہی ہے۔

Marfat.com

جو رہی خودی تو شاہی!

انسان کی پہچان انسانیت سے ہے یعنی کردار وعمل کی اُن خوبیوں سے جن کی بدولت ایک شخص حقیقت میں انسان بنتا ہے۔ کائنات میں انسان کی انفرادیت اس کے اعلیٰ اوصاف اور رویوں کی وجہ سے ہے۔ اِن اعلیٰ اوصاف میں سے ایک لازمی وصف خودداری اور عزتِ نفس ہے۔ بقول اقبالؒ:

ے تیری زندگی اِسی سے تیری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُوسیاہی

انسان کی عزتِ نفس کا تحفظ اور اس کا خوددار بن کر رہنا فطرت سے قریب تر اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو دوسری کسی بھی مخلوق کے مقابلے میں زیادہ اہتمام کے ساتھ پیدا کیا ہے، اِس کے ظاہر و باطن کو زیادہ حسن وخوبی سے آراستہ کیا ہے، لہٰذا اِس کا مقام واحترام کچھ زیادہ ہی ممتاز ومنفرد ہے۔

چاہیے کہ انسان کو خود بھی اس بات کا احساس ہو، اپنی عزت کا پاس ہو، اِس کے اپنے کسی رویے سے انسانی مقام ومرتبے پر زد نہ پڑے اور اس کی اپنی ہی کوئی حرکت اِسے اپنی ہی نظروں سے گرانے کا سبب نہ بنے۔ انسان کا اپنے آپ کی پہچان کرنا اور اس پہچان کا تحفظ کرنا خودداری ہے۔ اس وصف کی بدولت وہ اپنے رب کو پہچانتا ہے۔ ربُ العالمین کے سامنے تسلیم ورضا کا رویہ

Marfat.com

اس کی خودی اور خودداری کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اِس کے اپنے ہی ہاتھوں انسانیت کی توہین ہو گی۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنا، کسی بھی انداز سے دوسرے کی توہین کرنا، خواہ ڈانٹ ڈپٹ کی صورت میں ہو یا گالی گلوچ کی شکل میں، اس سے کسی کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی انسان کو زیب نہیں دیتا، یہ اِس کے وقار کے منافی ہے۔ خودداری کا تقاضا ہے کہ انسان خود محنت کرے، رزقِ حلال کمائے اور اپنی عزتِ نفس پر آنچ نہ آنے دے۔ دینِ فطرت انسان کو ہر صورت میں عزتِ نفس برقرار رکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ عزت و وقار زندگی کی پہلی ترجیح ہے نہ کہ کچھ اور، اس لیے انسان کو چاہیے کہ خودی نہ بیچے، غریبی میں نام پیدا کرے کیونکہ اُس رزق سے تو موت بہتر ہے جس سے پرواز میں کوتاہی آئے۔

دینِ فطرت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی فحش کلامی، بدزبانی اور ڈانٹ ڈپٹ سے کسی کی بے عزتی کرے، اپنے کسی رویے سے دوسرے کو کمتری کا احساس دلائے، کسی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جبکہ اللہ نے اُسے آزاد پیدا کیا ہے۔ یا کسی کی آواز کا گلا گھونٹ دے جبکہ اظہارِ رائے کا حق اُسے فطرت نے دیا ہے۔ ایسی سب باتیں انسان کی خودداری اور عزتِ نفس کے منافی ہیں۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود تکلیف دہ بات یہ ہے کہ دِن کے اُجالے میں لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ تمام تر روشنی کے باوجود اُن کی سوچ تاریکیوں میں سرگرداں رہتی ہے اور وہ اپنے ہاتھوں اپنی رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔

جہالت کی تاریکیوں میں مظاہرِ فطرت کے پجاریوں کو قرآنِ حکیم نے یہی تو سمجھایا تھا کہ ایسا کر کے اپنے انسانی تشخص یعنی خودداری اور عزتِ نفس کو مجروح نہ کرو، بلکہ اپنے حقیقی رب کو پہچانو جس نے تم سب کو اور کائنات کی ہر ہر شے کو عدم سے وجود بخشا اور پھر اُس کا حکم مانو۔ یہی رضا و تسلیم کا رویہ ہے جس سے انسان کی خودداری و تشخص کا ہر پہلو محفوظ ہو جاتا ہے۔ کردار و عمل کا ہر زاویہ مضبوط و حسین ہو جاتا ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں معتبر قرار پا جاتا ہے۔ یہی وہ روشنی ہے جو انسانی فکر و شعور کو تازگی اور توانائی فراہم کرتی ہے۔

□□□

Marfat.com

دامنِ اسلام کی وسعت

عالمِ انسانیت کے نام اسلام کے پیغام کا بنیادی مقصد اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم اور قانون کی بالادستی کا قیام ہے۔ یہ ایک عالمگیر پیغام ہے جس کی بنیاد پر مثالی عالمی معاشرہ معرضِ وجود میں لانے کے لیے پیش رفت ہوسکتی ہے۔ اگر رشد و ہدایت کے الہامی سلسلے پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے ہر نبیؑ کو اِسی پیغام کے ساتھ مبعوث کیا گیا کہ اُسی کے قانون اور ضابطے کی بالادستی فطرت کا تقاضا ہے۔ چونکہ اگلی پچھلی تمام ترنسلِ انسانی کا خالق ایک ہے لٰہذا اُس کا پیغام بھی سارے عالمِ انسانیت کے لیے ایک ہے۔ دنیا کا کوئی خاص و عام، سیاہ و سفید، عربی و عجمی، امیر و غریب، مرد و عورت اور کوئی چھوٹا بڑا اس سے مستثنٰی نہیں۔

نبوت و رسالت کا عظیم الشان سلسلہ مرحلہ وار نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ دینِ اسلام کے حوالے سے یہ ناگزیر ہوگیا کہ ہر بات کو بعثتِ نبویؐ کی روشنی میں دیکھا جائے کہ یہ لازمی تقاضائے فطرت ہے۔ کیونکہ سلسلۂ نبوت و رسالت کا آخری مرحلہ ہی گزشتہ تمام مراحل کے مقابلے میں جامعیت کا حامل ہے۔ اِسی آخری مرحلے کی تمام تعلیمات محفوظ ترین ہیں۔ اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو باقی مراحل کی تعلیمات کو اُن کے صحیح تر تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا اور نہ ہی ان کے بارے میں صحیح نکتۂ نظر اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

نبوت و رسالت کے گزشتہ مختلف مراحل میں مختلف الہامی کتب وصحف نازل کیے گئے

Marfat.com

جو دینِ فطرت کی ترجمانی کرتے رہے۔ آخری مرحلے میں قرآنِ حکیم نازل کیا گیا جو رشد و ہدایت کا حتمی اور فیصلہ کن مرحلہ قرار پایا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ اب کچھ اور نازل نہ ہوگا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی مبعوث نہ ہوگا۔ نسلِ انسانی کے ذہنی و روحانی، ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی نشو و ارتقاء کے لیے فکری و عملی راہنمائی کا تا قیامت اہتمام کر دیا گیا اور اُسوۂ حسنہ کی صورت میں سب کے لیے ایک ہی رول ماڈل مقرر کر دیا گیا۔

رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر انسان کو خبردار کر دیا گیا کہ لائقِ عبادت و سجدہ صرف وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے سب کو پیدا کیا اور جو ساری کائنات کا نظام چلاتا ہے۔ لوگو! تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا گیا۔ تم سب اولادِ آدم ہو اور آدمؑ کو مٹی سے بنایا گیا تھا۔ صفتِ تقویٰ سے آراستہ ہوئے بغیر کوئی کسی پر فضیلت حاصل نہیں کر سکتا۔

انسانی مساوات کا یہ عالمگیر تصور اسلام ہی کا پیش کردہ ہے۔ اس کے تحت ہر شخص کے تمام بنیادی حقوق اور مقام مرتبے کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ اس عالمگیر پیغامِ مساوات کے تحت اسلام ہر قسم کے ظلم و زیادتی، دہشت گردی اور حق تلفی کی مذمت کرتا ہے خواہ اس کا ارتکاب دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو رہا ہو۔ یہ صرف اسلام ہے جو دنیا میں سب کے لیے خواہ کوئی کافر ہو یا مسلم یکساں عزت و احترام اور فوائد و ثمرات کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ اسلام نے اللہ سے صرف ایمان والوں کو پھلوں کا رزق عطا کرنے کی دعا کی تھی تو ارشاد ہوا تھا کہ جو کافر بھی ہو میں اسے بھی دنیوی زندگی میں فائدہ پہنچاؤں گا۔ یہ دامنِ اسلام ہے جس کی وسعتوں میں انسانیت کی عافیت ہے۔

دینِ فطرت ہی اس امر کا حامی ہے کہ عزت سے زندہ رہنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو، اور ظالم اور مجرم سزا کا حق دار ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اللہ کا حکم اور قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصولی مؤقف اسلام کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا کہ جس نے جان بوجھ کر کسی جان کو قتل کیا تو گویا اس نے ساری نسلِ آدم کو قتل کر دیا۔

ایک حقیقی پُر امن معاشرہ اُسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب قوانین اور ضابطوں میں پایا جانے والا تضاد اور دوہرا معیار ختم ہو جائے، عادلانہ نظام قائم ہو اور ماورائے آئین و قانون کسی کو تحفظ حاصل نہ ہو سکے۔ ایسا بے لاگ اور شفاف نظام صرف دینِ فطرت کا ہے۔ جو چودہ صدیوں سے عالمِ انسانیت کو دعوتِ فکر دے رہا ہے اور قیامت تک دیتا رہے گا۔

Marfat.com

زبان اور ہاتھ

انسان کے اخلاق و کردار ہیں دو چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، زبان اور ہاتھ۔ زبان انسان کے مافی الضمیر کی ترجمان ہے جبکہ ہاتھ اس کی ظاہری حرکات وسکنات کا۔ زبان بولتی ہے، ہر طرح کی گفتگو کرتی ہے۔ اِنسان اِسی زبان سے سچ بولتا ہے اور اسی سے جھوٹ، اِسی سے کسی کی اچھائی بیان کرتا ہے، اسی سے غیبت، اسی زبان سے کسی کے حق میں من وعن سچی شہادت دیتا ہے اور اسی سے جھوٹی گواہی۔ یہی زبان ہے کہ جس سے میٹھا بول، بول کر انسان دوسروں کے دل جیت لیتا ہے اور اسی سے بدکلامی کر کے دوسروں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔ زبان ہی سے وعدہ کرتا ہے، قسم اُٹھاتا ہے اور زبان ہی سے اس کے خلاف کر بیٹھتا ہے۔ گویا زبان محض گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ انسانی کردار اور تشخص کی تشکیل میں اس کا بہت عمل دخل ہے۔

اِسی طرح ہاتھ کا معاملہ ہے جو قابلِ غور ہے۔ ہاتھ ظاہری اور عملی کارکردگی اور حرکت کی علامت ہے جو مثبت بھی ہوسکتی ہے اور منفی بھی۔ اِسی لیے ہاتھ کا لفظ محاورے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کام کو ہاتھوں ہاتھ لینا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا، ہاتھ لگنا وغیرہ۔ قرآن میں ''ید'' اور ''ایدی'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو بعض مقامات پر انسان کی کارکردگی کا مفہوم دیتے ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا:

☆ ''ظھر الفساد فی البرِ و البحرِ بما کسبت ایدی الناس''

Marfat.com

(لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی (بدعملی) کے باعث خشکی اور تری (ہر جگہ) میں فساد برپا ہو گیا)

☆ ''ولا تلقوا بایدیکم اِلی التھلکۃ''

(اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو)

☆ ''وما اصابکم من مصیبۃٍ فَبِما کسبت ایدیکم''

(تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کی بدولت پہنچی)

☆ ''ولن یتمنوہ ابداً بِماقدمت ایدیھم''

(یہودی اپنے ہاتھوں جو آگے بھیج چکے ہیں یعنی برے اعمال کر چکے ہیں اس کی وجہ سے وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے)

گویا ہاتھ محض ایک لفظ نہیں، ایک جسمانی عضو نہیں بلکہ انسان کے مجموعی کردار اور کارکردگی کی علامت ہے۔ اِس مختصر سے تجزیے سے ثابت ہوا کہ زبان اور ہاتھ انسانی زندگی کا بہت اہم اور بڑا حوالہ ہیں۔ پورے انسانی اخلاق و کردار کی عمارت اِن دونوں کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ کسی کا اخلاق کیا صورت اختیار کرتا ہے، اس کا انحصار زبان اور ہاتھ کے استعمال پر ہوتا ہے۔

حضور صاحبِ خلقِ عظیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اس حوالے سے توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ:

''المسلم من سَلِمَ اَلنَّاس من لِسانِہٖ ویدہٖ'' یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

زبان اور ہاتھ ہی معاشرے میں امن وامان اور صلح وسلامتی کی ضمانت بن جاتے ہیں اگر ان کا درست اور صحیح استعمال ہو۔ اور یہی دو چیزیں فساد، بدامنی، انتشار اور بحران کا باعث بن جاتی ہیں اگر ان کا استعمال غلط اور ناجائز ہو۔

اسلامی نکتۂ نظر سے زبان اور ہاتھ کے بارے میں خصوصی احتیاط ملحوظ خاطر رکھنے کی تاکید ہے تاکہ معاشرہ ان کے نقصانات سے محفوظ رہ سکے۔ کوئی کسی کا حق نہ مارے، کسی کی دلآزاری نہ کرے، انسان دوستی، باہمی محبت اور احترام کو فروغ ملے۔ زبان کا صحیح استعمال یہی ہوگا کہ انسان سچ بولے، کسی کی غیبت نہ کرے، جھوٹی گواہی نہ دے، بات بات پر قسمیں نہ کھائے، تفننِ طبع یا ذاتی مفاد کے تحت ایسے وعدے نہ کرے جو ایفاء نہ کر سکے، فحش کلامی نہ کرے، گفتگو میں اعتدال

Marfat.com

یعنی حُسنِ کلام کا مظاہرہ کرے۔ گفتگو کرتے وقت حفظِ مراتب کا خیال رکھے اور غیر ضروری گفتگو سے احتراز کرے۔

اِسی طرح ہاتھ جو ظاہری اعمال اور حرکاتِ انسانی کے حوالے سے پورے جسم کی نمائندگی کرتا ہے، بھی بہت توجہ طلب ہے۔ ہاتھ کے صحیح استعمال سے مراد یہی ہے کہ انسان کسی پر جبر اور زیادتی نہ کرے، چوری نہ کرے، ڈاکہ نہ ڈالے، رشوت اور سود وغیرہ سے کنارہ کش رہے، ظلماً کسی پر ہاتھ نہ اُٹھائے، شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی کے تمام تقاضوں کا لحاظ کرے۔ اپنی چال میں اعتدال پیدا کرے۔ مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے ممنوعہ مقامات پر نہ جائے۔ گویا چھوٹے بڑے تمام جرائم سے احتراز کرنا ہاتھ کے درست استعمال کا لازمی تقاضا ہے۔

□□□

مسلمان امن و سلامتی کا سفیر ہے،
اس کا انحصار زبان اور ہاتھ کے
صحیح ستعمال پر ہے۔

Marfat.com

خواب کی تعبیر

گھر والوں کو اپنا خواب سنانے کے بعد یاسر خانہ کعبہ کی طرف چلے گئے۔ وہاں قبیلہ بنومخزوم کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی بیٹھ گئے۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ بھیانک خواب کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ کسی کو سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے مگر لوگوں کی سردمہری دیکھ کر خاموش بیٹھے رہے۔

اُسی مجلس میں عمرو بن ہشام المعروف ابوجہل بھی تھا جو کسی نہ کسی بہانے بوڑھے یاسر اور اُس کے خاندان کو تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔ پوچھتا ہے، یاسر! آج تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ یاسر نے کہا بس ایسے ہی۔ ابوجہل کہنے لگا، مجھے تم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے جو عرصے سے میرے لیے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ کہا کون سی بات؟ ابوجہل نے کہا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ تم ہمارے معبودوں کے پاس گئے ہو یا ان کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہو۔

یاسر نے ہنس کر کہا۔ تو کیا کبھی برے الفاظ سے یاد کرتے ہوئے بھی سنا ہے؟ یا کبھی تم نے دیکھا ہے کہ میں نے تمہارے معبودوں کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو؟

ابوجہل غصے میں آ کر بولا اچھا! تو گویا وہ ہمارے ہی معبود ہوئے نا۔ تمہارا تو اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے کہا کیا مطلب! وہ اور بھی غصے میں آ گیا اور سخت لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔ ہاں! ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کون ہمارے ساتھ ہے اور کون خلاف ہے۔ اب وقت آ گیا

Marfat.com

ہے کہ مکے کا ہر باشندہ اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دے۔ اب تک ہم نے اپنے حلیفوں سے بہت نرمی برتی ہے مگر آج سے کوئی رُو رعایت نہیں ہوگی۔

اُس وقت تک یاسر ایمان نہیں لائے تھے تاہم وہ جھوٹے خداؤں اور بنومخزوم کے متکبرانہ رویے سے بیزار تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔ اُس مجلس میں ابوجہل نے ان کے ساتھ بہت بدتمیزی کی تھی اور اُن کے بیٹے عمار کو بے دین ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ ان کو اِس قدر دبایا اور پریشان کیا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو ابوجہل سے کہنے لگے، تمہیں شرم آنی چاہیے، تم اپنے حلیف سے بدسلوکی کرتے ہو! مزید کہا کہ اگر عمار بے دین ہو گیا ہے تو اس سے پہلے ارقم بھی تو اسی طرح کا بے دین ہو چکا ہے۔ اُس پر تو ہمارا بس نہیں چلتا۔ صرف اِس لیے کہ وہ تمہاری طرح کا سردار ہے اور میں کمزور!

گھر پہنچے تو سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ اہلیہ نے کہا یاسر، مبارک ہو! عمار دنیا اور آخرت کی بھلائی ہمارے پاس لایا ہے۔ عمار بولے۔ ابا جان! میں بے دین نہیں ہوا، بلکہ اُس ذات کی فرماں برداری اِختیار کر لی ہے جس نے زمین و آسماں بنائے، سورج چاند ستارے پیدا کیے اور محمد ﷺ کو ہمارے پاس رسول بنا کر بھیجا کہ وہ ہمیں سیدھی راہ دکھائیں۔

بوڑھا باپ نہایت توجہ سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ بیٹے کی یہ باتیں سیدھی اُس کے دل میں اتر رہی تھیں، وہ اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ بار بار کہتا تھا بے شک یہی ہے وہ جس کے لیے میں نے اپنا وطن چھوڑا تھا۔ اٹھے اور دربارِ رسالت میں جا کر مشرف با سلام ہو گئے۔

اُسی روز شام کو ابوجہل قبیلے کے کچھ آزاد اور غلام نوجوانوں کو ساتھ لے کر یاسرؓ کے گھر گیا۔ سب گھر والوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور گھر کو آگ لگا دی۔ ابوجہل کے لوگوں نے ان کو گھسیٹ گھسیٹ کر پیٹا اور ایک کوٹھڑی میں قید کر دیا۔

یاسرؓ اپنی اہلیہ سمیہؓ سے کہہ رہے تھے۔ آج پہلا دن ہے کہ میرا وہ خواب میرے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ عمارؓ کہہ رہے تھے، بے فکر ہو جائیے۔ اس کے بعد جنت ہے جہاں محمد ﷺ پر ایمان لانے والوں اور آپ کی دعوت قبول کرنے والوں کے لیے ہر طرح کا عیش و آرام ہے اور اللہ کی خوشنودی ہے۔

Marfat.com

خالص اور سچے ایمان کی یہی نشانی ہے کہ دل میں اترتا ہے تو دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔ طاغوت کے تمام حربے ناکام ہو جاتے ہیں۔ ایمان و وفا کے میدانوں کے رہ نورد کی عظمتِ شان کا کیا بیاں ہو! جس کی حق گوئی و بے باکی کے آگے ظلم و جبر کے پہاڑ بھی ریت کی دیوار ثابت ہوں۔

اِسلامی زندگی ہی تو اصل مقصودِ فطرت ہے۔ ایمان پر استقامت اس زندگی کی معراج ہے۔ داستانِ صحابہؓ اِسی سے عبارت ہے۔

؎ یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

□□□

Marfat.com

آں کتابِ زندہ!

بعثتِ محمدی ﷺ کا سب سے بڑا اور زندۂ جاوید معجزہ قرآن ہے جس کی عظمت کا بیاں شاید انسان کے بس میں نہیں۔ ہر دور کے مشکوک اور متذبذب ذہن کو اس کا چیلنج ہے کہ

”وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ o فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَo“

لوگو! اگر تمہیں قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کچھ بھی شک ہے تو اِس جیسی کوئی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اِس کام کے لیے جن کو تم اپنے حمایتی اور مددگار سمجھتے ہو اُن کو بلا لو، اگر تم حق پر ہو۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کرسکو جو کہ تم ہرگز کر بھی نہیں سکو گے تو پھر اُس آتشِ دوزخ سے بچنے کی تدبیر کرو جو بطورِ خاص کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

تمام تر الہامی کتابوں میں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے صرف قرآن کو صفتِ لاریب سے متصف کیا۔ ”ذٰلك الكتاب لا ريب فيه“ دنیا بھر کی زبانوں پر حاوی ہو جانے والی فصاحتِ عرب بھی اس کی تاب نہ لا سکی۔ ہر پہلو سے مبنی برحق وصداقت ”وَمَن اصدق مِن اللّٰه حديثاً“ کون ہے وہ جس کی بات اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی ہے! ہدایت کا بحرِ بے کراں کہ جو ”هُدىً للمتقين“ تو ہے ہی۔ ”هُدىً للناس“ ہونے کا بھی بجا طور پر علم بردار ہے۔ عالمِ انسانیت کی

Marfat.com

حقیقی فوز و فلاح قرآن ہی میں مضمر ہے۔ ''اِنَّ ھٰذا القرآن یھدی للّتی ھِیَ اقوم'' یہ قوموں کے عروج و زوال اور نشیب و فراز کا معیار ہے۔ ''یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا وَ مَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ'' جو اس پر ایمان لایا، اس کے ساتھ وابستہ ہوا، مطلوب و مقصود فطرت ٹھہرا۔ جو اِس سے ہٹا ''اسفل سافلین'' ہوا، اُس پر ہدایت اور فلاح کے تمام راستے بند ہو گئے۔

حضور حامل قرآن محمد رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہوتا ہے:

''قُلْ ھُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھُدًی وَّشِفَآءٌ وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرٌ وَّھُوَ عَلَیْھِمْ عَمًی اُوْلٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ''

(اے نبی ﷺ! کہہ دو کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے مگر جو اس پر ایمان نہیں لاتے اُن کے کانوں میں بہرہ پن ہے، جو اُن کے حق میں اندھے پن کا باعث ہے۔ ایسوں کو دُور سے آوازیں دی جاتی ہیں۔)

قرآن فطرت کی پکار ہے مگر جو اس پکار پر کان نہ دھرے تو اُس کی مرضی۔ دینِ فطرت میں جبر تو ہے نہیں۔ اللہ نے قرآن کا فہم اِنسان پر آسان کر رکھا ہے مگر اُس کے لیے جو اِس کی طرف رجوع کرے، متوجہ ہو، اس کی ضرورت محسوس کرے۔ قرآن حکیم کا فہم و ادراک ایک غیر معمولی بات ہے۔ بے مثال کلام اور خاص کتاب ہونے کے ناتے اس کا فہم بھی خاص ہے، جس کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ حامل قرآن کو قرآن کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اِس کا من و عن فہم بھی اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی ودیعت ہوا اور آپ ﷺ کی حدیث و سیرت مطہرہ قرآنِ حکیم کی بہترین تفسیر ٹھہری۔ آپ ﷺ کے اصحابِ کرامؓ نے براہِ راست آپ ﷺ سے اکتساب فیض کیا۔ انہوں نے اِس مقصد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ ایمان لانے کے بعد اصحابِ رسول کی ترجیحات میں پہلی ترجیح صرف اور صرف فہم قرآن اور اطاعتِ رسول ﷺ تھی۔

مکہ مکرمہ میں دارارقم اور مدینۃ النبی میں صفہ رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ وہ اوّلین درس گاہیں تھیں جہاں سے سب سے پہلے قرآن و حدیث کے فہم و ادراک کے چشمے پھوٹے، جن کی فیض رسائیوں نے تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور زمانۂ جاہلیت کی غبار آلود لوحِ ذہن سے کفر و ضلالت کی جمی ہوئی تہہ کو کھرچ ڈالا۔

قرآن فی زمانہ کتابِ زندہ ہے۔ اِنسان کو اگر اپنی صحت مند فکری و عملی زندگی مطلوب

Marfat.com

ہے تو اِس کتابِ زندہ کے ساتھ خالص وابستگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اپنے وِژن کو اِس کتاب حکمت کی روشنی میں بروئے کار لانا ہوگا۔ اس کے بغیر اسلامیت وانسانیت کا تصور بے معنی ہے۔ یہ واحد کتاب ہے جو حرف بہ حرف مبنی برحق وصداقت اور سب سے زیادہ غیر جانبدار ہے، ہر حوالے سے اصولی مؤقف پر قائم ہے اور مسلسل دعوتِ فکر دے رہی ہے۔ ہے کوئی جو سوچے سمجھے! ہے کوئی اس ابدی روشنی کا طلب گار!

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُولا یزال است وقدیم

□□□

Marfat.com

اِصلاحِ اَخلاق

اِنسانیت کا تقاضا ہے کہ اِنسان کا اخلاقی معیار بہتر ہو۔ وہ جھوٹ فریب اور فحشا سے اجتناب کرے۔ جھوٹ فریب اور فحاشی وہ رزائل اخلاق ہیں جو انسانی کردار کا ناسور ہیں، جن سے ہر قسم کی اخلاقی برائی اور خرابی جنم لیتی ہے اور افرادِ معاشرہ اخلاقی زوال کے سائے تلے اعلیٰ انسانی اوصاف سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اعلیٰ معاشرتی قدریں دب جاتی ہیں اور بہت بڑا انسانی المیہ جنم لیتا ہے۔ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے، حقیقت پر پردہ ڈالتا ہے تو خدائے برحق کے وجود تک سے اِنکار پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ کسی کو فریب دیتا ہے، دغا بازی کرتا ہے تو حقوق انسانی کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے اور جب فحاشی کا ارتکاب کرتا ہے تو حیوانیت کو فروغ دیتا ہے۔ یہ سب بالآخر معاشرے کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں نے اپنی بداخلاقیاں جاری رکھنے کے لیے اللہ کے نبیوں کو خوفزدہ کیا، جلاوطن کیا اور ان کو قتل کرنے کا گھناؤنا جرم تک سرزد کیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ پھر بھی اپنے آپ کو پاک صاف کہتے رہے۔ قرآن کہتا ہے: ''قُل فَلِمَ تقتلون انبیاء اللّٰہ بغیر الحق'' اے نبی ﷺ، اِن سے پوچھو! تم اللہ کے نبیوں کو کیوں ناحق قتل کرتے رہے؟

اَخلاقی بے راہ روی پوری زندگی کا بگاڑ ہے جیسا کہ دل کا بگاڑ پورے جسم کا فساد ہے۔ زندگی کی اجتماعی اصلاح وفلاح کا انحصار اصلاحِ اخلاق پر ہے اور اِصلاح اخلاق کے لیے ضروری

Marfat.com

ہے کہ انسان پر دنیا کی بے ثباتی اور مادی فوائد کی حقیقت بے نقاب ہو جائے تا کہ وہ اس میں اندھا دھند گم نہ ہو اور دنیا داری کی دوڑ میں اخلاقی ضابطوں اور قدروں کو پامال نہ کرے۔ کس قدر زندہ اور روشن مثال ہے کہ مشرکین نے جب خود ساختہ خداؤں کی بے بسی دیکھی تو بالآخر وہ اُن سے متنفر ہو ہی گئے۔ جب تک اِنسان ذاتی مفاد اور دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور حقیقی انجام سے آنکھیں چرائے رکھتا ہے تب تک وہ اپنے اخلاقی معیار کو بہتر بنانے سے قاصر رہتا ہے۔

دینِ فطرت ہر شے کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے، دنیا ہو یا آخرت اُسے اُس کے صحیح تر تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اسلام کی نظر میں دنیا کی زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ''مزرعة الآخرة'' یعنی دار الاعمال ہے۔ جہاں ہر شخص کو مقررہ وقت کے لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ یہاں ایک خاص مقصد کے تحت زندگی گزارے۔ ''ولکم فی الارضِ مستقر و متاعٌ اِلٰی حین'' چنانچہ دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنا مناسب نہیں۔ ایسا گمان کرنا محض دھوکا ہے اور اِسی حوالے سے یہ فرمایا گیا کہ ''وما الحیوٰةُ الدنیا اِلّا متاعُ الغرور'' دنیوی زندگی تو محض دھوکے کا سودا ہے، محض دنیا کا فائدہ تو کچھ بھی نہیں۔ ''متاعٌ قلیل ولھم عذاب الیم'' یہ وہ صورتِ حال ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ چشم بینا رکھتا ہو۔

دنیا کی اِس حیثیت کے پیشِ نظر اِنسان کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے، یوں رہنے کی ضرورت کہ جیسے وہ مسافر ہو۔ سفر میں اُسے زادِ راہ بھی چاہیے اور منزلِ مقصود پر پہنچنے کی فکر بھی۔ قرآن کہتا ہے: بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور منزل آخرت کی زندگی ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ یہی انسان کا انجام ہے جو بہت اچھا بھی ہو سکتا اور بہت خوفناک بھی۔ دنیا اور دنیوی فائدے کو اس تناظر میں دیکھنا ہو گا کیونکہ حقیقت پسندی اور فطرت سے قریب تر بات یہی ہے۔ جب ایسا ہو گا تو کوئی شخص جھوٹ نہیں بولے گا، سچائی کا انکار نہیں کرے گا، کسی کا حق نہیں مارے گا، کسی کی دلآزاری نہیں کرے گا، فحاشی و عریانی کو فروغ نہیں دے گا۔ بلکہ وہ آخرت کی فکر کرتے ہوئے اپنے اخلاقی معیار کو بہتر بنائے گا۔ مادیت پرستی کی دوڑ میں حصہ لینے کی بجائے حسنِ اخلاق پر توجہ دے گا اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فروغ ملے گا۔

□□□

Marfat.com

نجات کا راز

ہرانسان کی خواہش ہے کہ اُس کی نجات ہو جائے اور یہ خواہش بالکل فطری ہے۔ فکر وغم سے آزادی، رنج والم سے رہائی، یہ ہر کسی کی دلی آرزو ہے۔ نجات کا تصور کم وبیش دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہے مگر اپنے اپنے انداز میں۔ بتایا گیا ہے کہ حصولِ نجات کے لیے انسان کا اچھا اور باکردار ہونا بہت ضروری ہے۔ نجات یہ ہے کہ انسان رنج وغم اور دکھوں سے چھٹکارا پا جائے اور ایک ایسے ماحول میں داخل ہو جائے جہاں ہر طرف راحت و آرام اور حسبِ خواہش آسائش کا سامان ہو۔ یقیناً یہ ایک 'Ideal situation' ہے جس کے لیے ہر کوئی تمنا کرتا ہے۔ وسیع تر تناظر میں اِسے ہی جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا میں اس کا صرف حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خوب صورت اور پُر آسائش جگہ کو جنت نظیر کہا جاتا ہے مگر حقیقت میں نجات اور جنت کا مثالی تصور آخرت کی زندگی سے وابستہ ہے اور یہ اُن لوگوں کا ابدی ٹھکانہ ہوگا جنہوں نے حقیقت اور فطرت سے قریب تر زندگی گزاری ہوگی یعنی قانونِ فطرت کی پیروی کی ہوگی۔

حقیقت اور فطرت کا بنیادی تقاضا عدل ہے اور عدل وانصاف کا اولین تقاضا سچائی۔ انسان کو سچائی تسلیم کرنا ہوگی اگر یہ اچھی اور معتبر زندگی گزارنے کا خواہاں ہے۔ ایسی زندگی جو نجات پا جائے اور اِنسان جنت میں داخل ہو جائے۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی سچائی جس کا اعتراف ناگزیر ہے یہی ہے کہ کائنات کو معرضِ وجود میں لانے والی ذات ایک ہے، وحدہٗ لاشریک ہے،

Marfat.com

اُس پر ایمان لانا اِنسان کے لیے بہر صورت لازم ہے۔

ایمان قلبی کیفیت کا نام ہے۔ سوچ سمجھ کر دل کی گہرائیوں سے خالق کائنات کی ذات، صفات اور قدرت مطلقہ پر ایمان لانا اِنسان کے صحیح العقیدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اللہ کی ہر بات کو سچ مانتا ہے اور اُسے تسلیم کرتا ہے۔ وہ اللہ کے نبیوں اور رسولوںؑ، الہامی کتابوں، فرشتوں اور جنت و دوزخ کے برحق ہونے پر بھی پختہ یقین رکھتا ہے۔ اللہ ہی کے حکم اور قانون کو نجات اور فلاح کا ضامن سمجھتا ہے۔ یہ ایمان ہے جو اُسے جنت سے قریب تر کرتا ہے۔

انسان طبعاً سماج پسند واقع ہوا ہے۔ اِنسانی زندگی کے تمام امور و معاملات سماج یعنی معاشرے ہی میں انجام پاتے ہیں۔ بہت ضروری ہے کہ اِنسانی زندگی کے تمام رویے، رابطے، معاملات اور اخلاق و عادات بحسن وخوبی انجام پائیں۔ سماجی ڈھانچہ جب تک خلوص، ہمدردی اور باہمی اعتماد پر اُستوار نہ ہو، مطلوبہ معاشرتی مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ معاشرے میں ایک دوسرے کی خیر خواہی چاہیے۔ باہمی الفت و محبت کا ماحول چاہیے۔

وہ ایمان جس میں اِنسان کے لیے نجات اور جنت کی ضمانت دی گئی ہے اُس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مدنی الطبع ہونے کے ناتے اِنسان اپنی عائلی اور سماجی ذمے داریاں پوری کرے، اِنسان دوستی، احترامِ آدمیت اور لوگوں سے بے لوث محبت اِنسان کی بنیادی سماجی ذمے داری ہے۔ والدین کی اولاد سے محبت اور اولاد کی والدین سے، بہن بھائیوں کی باہمی محبت، زوجین کی آپس کی محبت، یہ سب محبتیں تو بہت قریبی انسانی تعلقات کی غمازی کرتی ہیں، عام انسانی حوالے سے پیغام محبت دین فطرت کا پیغام ہے جو کسی مصلحت، مجبوری یا خونی رشتے کا پابند نہیں۔ اگر اِنسانی محبت کو مجبوریوں اور مصلحتوں کا پابند کر دیا جائے تو معاشرہ طبقوں میں بٹتا ہے۔ نسل انسانی بنیادی طور پر ایک ہے۔ سب کو پیدا کرنے والا ایک ہے، سب کو ایک مقصد کے تحت پیدا کیا گیا اور سب کو ایک ہی ضابطے کا پابند کیا گیا تھا۔ اِس حوالے سے محبت ہر شخص کا حق ہے۔

تاہم اِس حق کا زیادہ مستحق وہ ہے جو ضمیر کی آواز اور فطرت کی پکار سنتا ہے۔ گویا انسان ہیں تو سبھی مگر اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہ ہے جو اُس پر ایمان لائے، اُس کی بات مانے، وہی اللہ اور اُس کے بندوں کی محبت کا زیادہ حقدار ہے۔ نجات بھی اُسی کے لیے ہے۔

Marfat.com

حقِ زندگی اور دہشت گردی

بنیادی انسانی حقوق میں حقِ زندگی یعنی زندہ رہنے کا حق سب سے پہلا حق ہے۔ باقی تمام حقوق اسی بنیادی حق کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انسان کا مقام کائنات میں بہت محترم اور معتبر اور دیگر ہر مخلوق سے برتر ہے۔ خود اللہ ذوالجلال والاکرام نے اِسے عزت وتکریم بخشی۔ کائنات کو اِس کے لیے مسخر کیا۔ اس بنا پر انسان کی زندگی دوسری کسی بھی مخلوق سے زیادہ قیمتی اور قابلِ قدر ہے۔ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ زندگی گزارے، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔ دنیا کا کوئی مذہب، نظامِ اخلاق، کوئی قانون کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی کی جان کو نقصان پہنچائے سوائے اِس کے کہ کوئی قتلِ عمد کا مرتکب ہوا ہو، یا کسی نے شریعت کی مقرر کردہ کچھ دیگر حدود کو توڑا ہو۔ اُس صورت میں بھی کسی فرد کو نہیں بلکہ یہ حق اور اِختیار ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کا ہے کہ مجرم پر سزا نافذ کرے۔

انسانی تاریخ کا یہ بدترین المیہ ہے کہ حقوقِ انسانی کے سلسلے میں جس قدر اِنسانی جان کی قدر اور حرمت بیان ہوئی اُس کو سراسر نظر انداز کرتے ہوئے لوگوں کا خون بہایا جاتا رہا ہے۔ دورِ جاہلیت میں جنگ وجدل کا سلسلہ اکثر جاری رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی ہو جاتی جو خون ریز صورت اِختیار کر جاتی۔ قوموں اور قبیلوں کی آتش انتقام بھڑکتی رہتی، بے دریغ قتل و غارت کا بازار گرم رہتا۔ یہ اُس دور کا معمول بن چکا تھا۔۔۔ اِسلام نے ہدایت کی روشنی پھیلائی۔ انسان کا

Marfat.com

زاویۂ فکر تبدیل ہونے لگا۔ معاشرے کی کایا پلٹنے لگی اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھانے والے باہم شیر وشکر ہو گئے۔ ایک ایسا انقلاب برپا ہوا کہ صدیوں سے انتقام کی آگ کا اُبلتا ہوا سمندر دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔ ''اِنما المومنون اِخوہ'' کے اُصولِ اخوت کی بدولت نہ صرف مسلمان یکجا اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے بلکہ اِس کے روح پرور اور دور رس اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوئے۔

ایک طویل عرصے تک اِنسانی معاشرے نے اخوتِ اسلامی کی برکات خوب خوب سمیٹیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ امن وسلامتی کی فضا مسموم ہونے لگی۔ آستینوں میں سانپ پلنے لگے۔ امن کے دشمن سر اُٹھانے لگے۔ ابھی صلیبی جنگوں میں بہنے والے خونِ ناحق کی ندیاں خشک نہ ہو پائی تھیں کہ عالمی جنگ نے تباہی مچا دی اور حقوقِ انسانی کے علمبردار دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر ایک اور عالمی جنگ نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اِسی دوران فلسطین کے المیے نے جنم لیا، بے گناہوں کو اُن کی زندگیوں سے محروم کرنے کا منظم سلسلہ جو وقت کے ساتھ ساتھ شدید تر ہوتا چلا گیا۔

اِنسانی تاریخ ۲۱ ویں صدی عیسوی میں داخل ہو گئی جو تہذیب اور سائنس کی صدی بھی کہلاتی ہے مگر بدقسمتی سے قتل وغارت کا طوفان نہ تھما۔ اِس سلسلے کی بدترین کڑی دہشت گردی ہے۔ آج کا اِنسان دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ وہ خوف کے سائے میں سانس لے رہا ہے۔ اُس کا سکون برباد ہے۔ زندگی بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ آج کا اِنسان کہیں بھی خود کو محفوظ و مامون نہیں پاتا۔ احساسِ تحفظ مجروح ہو چکا۔

مارکیٹوں، عبادت گاہوں، بسوں اور ٹرینوں میں آئے دن ہونے والے دھماکوں نے کتنے آنگن ویران کر دیے! کتنی بہاروں کو خزاں رسیدہ کر دیا! کتنے پھولوں کو مسل دیا! آخر یہ سب کیا ہے؟ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ لمحہ فکریہ ہے! دینِ فطرت امن وآشتی اور صلح وسلامتی کا دین ہے۔ فطرت اور عدل کا تقاضا ہے کہ جسم کے ناسور زدہ حصے کو الگ کر دیا جائے تاکہ باقی جسم کو بچایا جا سکے۔ لہٰذا شر پسندوں کے وجود کا خاتمہ ناگزیر ہے۔

معاشرے کو خوف وہراس اور دہشت کی کیفیت سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ ذمے دار ہوں، وہ اپنی ذمے داریاں پوری کریں۔ شر پسند عناصر کے خلاف اجتماعی

Marfat.com

جدوجہد کی ضرورت ہے۔ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھنے والے بے گناہوں کا خون انسانی ضمیر کے لیے سوالیہ نشان ہے؟ مسلمان کی تعریف تو یہ بیان ہوئی ہے کہ اُس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہتے ہیں اور وہ امن وسلامتی کا سفیر ہوتا ہے۔

□□□

لازم ہے کہ مجرم قانونِ عدل سے
خوف زدہ رہے

Marfat.com

ایک دِل خراش حقیقت

تاریخ میں دورِ جاہلیت کا ایک حوالہ ایسا بھی ہے جو اِنسانی ذہن اور اخلاق و کردار کی انتہائی پستی پر دلالت کرتا ہے۔ اصول کی بات ہے کہ جب قانونِ فطرت کو فراموش کر دیا جائے اور اُس سے انحراف کرتے ہوئے اِنسان اور راستوں پر چل نکلے تو حقوق پامال ہوتے ہیں اور انسانی قدریں دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ زندگی کا نقشہ بہت بھیانک صورت اِختیار کر جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کا اِنسان اس حوالے سے بدنام ہوا کہ وہ بے رحم تھا اور بے رحمی کی آخری حد کو پھلانگ چکا تھا جس کا ایک ثبوت یہ کہ عورت کی تحقیر انتہا کو پہنچ گئی۔ بعض قبائل کا یہ حال تھا کہ بچیوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا جاتا جس کی صورت یہ تھی کہ ان کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ باپ خود اپنی بیٹی کے لیے گڑھا کھودتا، اپنے ہاتھوں سے اُسے اس میں دھکیلتا۔ وہ بے چاری چیختی اور تڑپتی رہ جاتی، بے رحم باپ اپنے ہاتھوں سے اُس کے اوپر مٹی ڈال دیتا، نجانے زندہ درگور کی جانے والی جان مٹی کے نیچے دب کر کس طرح تڑپ تڑپ کر دم توڑتی ہوگی!

اُس زمانے کی یہ وہ دل خراش حقیقت ہے جس کے تصور سے روح کانپ جاتی ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اُن زندہ دفن ہونے والی بچیوں کے باپ اپنے ضمیر پر اس بھیانک جرم کا بوجھ اُٹھائے کس طرح زندہ رہتے ہوں گے! اِسے حوصلہ کہیں یا سنگ دلی کی انتہا۔ اُن لوگوں کے نزدیک یہ بات غیرت اور شجاعت کی علامت ہو تو ہو، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بگڑی ہوئی

Marfat.com

غیرت کو غیرت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خصلت تو سانپ کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے۔ انسان کے اندر تو سب سے زیادہ جذبۂ رحم رکھا گیا ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت تو ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ گویا وہ اِنسان ہی کیا جس میں اپنی اولاد کے لیے جذبۂ رحم نہ ہو۔

عہدِ جاہلیت کے اِنسانی ذہن میں تو جہالت اور گمراہی رچی ہوئی تھی مگر صد افسوس کہ روز روشن کی طرح واضح ہدایت آنے کے باوجود معاشرے میں جاہلانہ اثرات اب بھی موجود ہیں۔ چند دن ہوئے ایک رپورٹ سامنے آئی۔ یہ رپورٹ ہمسایہ ملک کے بارے میں تھی جس میں بتایا گیا کہ وہاں اب بھی یہ رسم بد موجود ہے۔ لوگ اب بھی بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے ہیں۔ یہ حالت دورِ حاضر کی ہے کہ جامع الہامی ہدایت کی روشنی کے باوجود انسان گمراہی میں مبتلا ہے۔ جان بوجھ کر جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ ایک طرف اہنسا کی بات ہے کہ کسی جان کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور جانوروں تک کو تحفظ فراہم کیا جائے اور دوسری طرف لوگوں کو بے دریغ مار دیا جاتا ہے۔ زندہ جانوں کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ ہندو مت بہت قدیم مذہب ہے۔ اِس کی اصل تعلیمات میں ایک خدا کا تصور بھی تھا اور انسانی حقوق کا بھی، لیکن یہی سرزمین ہے جہاں سے ستی جیسی خلافِ فطرت اور انسانیت سوز رسم چلی اور وہ بھی اب تک جاری ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ خاوند مر جائے تو بیوی کو بھی اُس کے ساتھ جلا کے مار دیا جائے۔

اسلام پہلا اور آخری دین ہے جس نے اخلاق و کردار کی اِصلاح، انسانی قدروں کے تحفظ اور باہمی رحم و کرم پر سب سے زیادہ زور دیا۔ واضح کیا گیا کہ ایک دوسرے کو معاف کرنا چاہیے، تاکہ اللہ کے ہاں معافی مل سکے۔ مخلوقِ خدا پر رحم کیا جائے۔ بچوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے، بڑوں کا احترام کرنا چاہیے، جو ایسا نہیں کرتا وہ دین داری سے دور ہے۔

جو لوگ بچیوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے انہیں زندہ دفن کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کا نوٹس لیا۔ ان کو وارننگ دیتے ہوئے اس قبیح حرکت کو بے نقاب کیا کہ اُن میں سے جب کسی کو یہ خبر دی جاتی کہ اُس کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے تو اُس کا منہ لٹک جاتا اور وہ شدید غم و غصے میں بھر جاتا اور اس خبر کو لوگوں سے چھپاتا پھرتا۔ پھر یا تو اُسے زمین میں گاڑ دیتا یا ذلت کے ساتھ باقی رہنے دیتا۔ خبردار کیا گیا کہ بچیوں کے بارے میں لوگوں کا اِس قسم کا فیصلہ بہت برا ہے۔ (اَلَا سَاءَ مَا یَحْکُمُوْن)

□□□

Marfat.com

کسی چراغ کی لَو سے کسی کا گھر نہ جلے!

گزشتہ دنوں اِس خبر نے تڑپا کے رکھ دیا کہ ایک چھوٹی سی بچی جو گلے میں پتنگ کی ڈور پھرنے سے زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھی، بالآخر اُس کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی اور وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ ناحق ایک جان چلی گئی، لواحقین تو لواحقین ہیں اُن کا دکھ اور صدمہ تو کسی تعارف کا محتاج نہیں، اُن والدین کے غم کی شدت کو شاید بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم دیکھنے اور سننے والے صاحبانِ احساس بھی اس قسم کا دکھ اور المیہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مقامِ عبرت ہے کہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں۔ اس قسم کی مجموعی ہلاکتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کے پیچھے پتنگ بازی کا عنصر کارفرما رہا ہے۔ ہلاکت خیزی کا یہ بھیانک سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے کہ پھول مرجھا رہے ہیں، جو بن اُجڑ رہے ہیں، آنگن ویران ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کون کسے سمجھائے! اگر سمجھنا ہو تو بدترین زلزلے کی عبرت سامانیاں کیا کم تھیں! سیلابوں اور قدرتی آفات کی لائی ہوئی تباہ کاریوں سے ہی کچھ سبق سیکھا ہوتا! لیکن اللہ معاف کرے، معلوم نہیں ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ ایک طرف صفِ ماتم بچھتی ہے تو دوسری طرف جشنِ بہاراں کا سماں برپا ہو جاتا ہے۔ شاید ہمارے پیچھے رہ جانے کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ رنگ رلیاں اور طاؤس و رُباب ہی داستانِ زوال کا عنوان بنا کرتے ہیں۔ وطن کے نغمے لکھنے والے تو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ایک پرچم تلے ہم سب ایک ہیں، ہماری خوشیاں اور غم ایک ہیں۔ مگر عجیب

Marfat.com

منظر ہے کہ جو معاشرہ بدقسمتی سے پہلے ہی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہو اُسی معاشرے کے کچھ عناصر اس انداز سے جشن منائیں کہ اُن کی پتنگوں کی ڈوروں سے لوگوں کے گلے کٹ کٹ جائیں۔

بسنت اور جشنِ بہاراں کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کس قوم کا تہوار ہے؟ اِس وقت اِس سوال سے کوئی غرض نہیں۔ دینِ فطرت کی تو یہ خوبی ہے کہ اِس میں کسی بھی سلسلے میں مخالفت برائے مخالفت روا نہیں بلکہ صرف اُصولی مؤقف کی بنیاد پر اِختلاف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذمت اس بات کی نہیں کہ کوئی پتنگ اُڑاتا ہے بلکہ مذموم اور باعثِ اِختلاف بات یہ ہے کہ پتنگ کی ڈور سے کسی کی گردن کٹ جائے، کسی تفریح کے نام پر اخلاقی قدریں پامال ہوں۔ ہوائی فائرنگ سے کسی کو زخمی یا ہلاک کر دیا جائے، یا بے ہنگم شور وغل سے دوسروں کا جینا حرام کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ افسوس ناک اور قابلِ مذمت ہے۔ صرف اسلام ہی نہیں اِن حرکات کی اجازت تو دنیا کا کوئی بھی مذہب اور قانون نہیں دیتا۔ اسلام تو اسلام ہے، دینِ فطرت جس میں اس بات کا سب سے زیادہ اہتمام ہے کہ لوگوں کے اخلاق درست کیے جائیں، اُن کو شرم وحیا کے زیور سے آراستہ کیا جائے، لوگوں کے جان و مال کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے، اُن کو ایک دوسرے کا ہمدرد اور غم خوار بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اِس کے لیے قواعد وضوابط اور اُن کی پابندی کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے اسلام کا ضابطۂ اخلاق بہت واضح ہے۔ یہ تو ہے ہی سراسر امن وسلامتی اور صلح وآشتی کا دین۔ اس بات کی حوصلہ افزائی کیسے کی جائے کہ کوئی اپنی تفریحِ طبع کی خاطر دوسروں کی زندگیوں سے کھیل جائے یا اُس کی تفریحِ طبع معاشرے میں اخلاقی بگاڑ پیدا کر دے۔

ڈور پھرنے سے جانوں کا ضیاع کسی کو دانستہ طور پر ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ اب تو ہر خاص وعام جان چکا ہے کہ جس کے ڈور پھرے گی وہ جان سے جائے گا۔ الا ماشاء اللہ! ایسے واقعات کو محض حادثاتی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ واقعات حادثاتی اُس وقت تھے جب اِکّادُکّا تھے اور لوگوں کو ڈور کے انتہائی خطرے کا اندازہ نہیں تھا۔

خوشی کا جشن منانے سے تو کسی کو کوئی نہیں روک سکتا، مگر خوشی بھی تو ہو! کوئی قابلِ فخر کام کیا ہو، کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ لیکن اگر جشن برائے جشن ہی ہے تو بھی کم از کم یہ احساس تو رہے کہ کسی چراغ کی لَو سے کسی کا گھر نہ جلے!

□□□

Marfat.com

حیاتِ اُخروی فسانہ نہیں!

دُنیا کی زندگی اور موت کے برحق ہونے میں تو کسی کو شک نہیں۔ البتہ حیاتِ اُخروی کے بارے میں مختلف اقوام کے عقائد ونظریات مختلف ضرور رہے ہیں اور اس حوالے سے شکوک وشبہات کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ مرنے کے بعد زندگی کا اِمکان نہیں۔ اِنسان مر کر مٹی میں مِل جاتا ہے اور بس! کسی نے کہا کہ مرنے کے بعد اِنسان کی رُوح کبھی کسی اور کبھی کسی جسم میں منتقل ہو کر دُنیا میں آتی رہتی ہے اور انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ اِسے تناسخ یا جونی چکر کہا گیا۔ کسی کا مؤقف یہ رہا کہ آخرت کی زندگی تو ہے مگر جزا و سزا وغیرہ کچھ نہیں۔

صحیح بات کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے اُس سرچشمۂ رُشد وہدایت کی طرف جانا پڑے گا جو سب سے قدیم اور سب سے زیادہ معتبر ہے یعنی دینِ فطرت، جس کی تبلیغ وتفہیم کے لیے تاریخ کے ہر دور میں ہر قوم کی طرف ہادیانِ برحق مبعوث کیے جاتے رہے یہاں تک کہ الہامی سلسلۂ ہدایت اپنی تمام تر جامعیت کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گیا اور ہمیشہ کے لیے حق وصداقت اور اصلاح وفلاح کا حتمی معیار قرار پایا۔ آخرت کے بارے میں صحیح تر تصوّر دینِ فطرت ہی نے پیش کیا اور لوگوں کے ذہنوں میں پائی جانے والی غلط فہمیوں اور شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیا۔

جو لوگ کہتے تھے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ اُن کے مؤقف کو اِس دلیل کے ساتھ ردّ کر دیا گیا کہ آخرت تو عین تقاضائے فطرت ہے۔ موت فنا کا نام نہیں بلکہ

Marfat.com

'Conversion' ہے، یعنی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا۔ اِنکار کرنے والوں نے کہا تھا کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم مر جائیں، نام ونشان تک مٹ جائے اور ہمیں پھر سے زندہ کر دیا جائے۔ بڑی عجیب بات ہے! اُن سے کہا گیا کہ ایسا ہونا کوئی عجیب بات نہیں اور یہ کہ خواہ کوئی لوہے یا پتھر یا اِس سے بھی کسی سخت شے میں منتقل ہو جائے، جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ اُس میں زندگی کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے، خالقِ کائنات اِس پر پوری طرح سے قادر ہے کہ اُسے پھر سے زندہ کر دے۔ انسان کو سمجھایا گیا کہ اُس کے اپنے وجود میں اور اُس سے باہر کی کائنات میں بہت سی مثالیں، بہت سے عقلی اور سائنسی دلائل وشواہد موجود ہیں جو اُخروی زندگی کے حق میں زندہ ثبوت ہیں۔ مُردہ اور بنجر زمین کی مثال پیش کی گئی، جو لوگوں کے سامنے زندہ اور زرخیز زمین میں بدل جاتی ہے۔ عمل اور ردِّ عمل کا مسلمہ سائنسی اصول حیات بعدالموت کی شہادت پیش کر رہا ہے۔ مادے کے فنا نہ ہونے کا اصول بھی انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ غور وفکر کرے اور حقیقت پسندانہ رویہ اپنائے۔ نیز یہ کہ جب ہر شے کا کوئی نہ کوئی متضاد ہے یعنی رات اور دن، آگ اور پانی، آسمان اور زمین، مشرق ومغرب، خالق ومخلوق تو دُنیا کی زندگی کو اِس کے متضاد سے کیونکر مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے! دُنیا کا متضاد بہرحال آخرت ہی ہے۔

آخرت کے بارے میں جن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان بار بار جنم لیتا ہے، اُس کی روح مختلف جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ دینِ فطرت اس عقیدے کو بھی غیر فطری اور خلافِ عقل قرار دیتے ہوئے رد کرتا ہے کہ قانونِ فطرت کی رُو سے ہر رُوح کا تعلق ایک مخصوص جسم سے ہے، وہ دوبارہ بھی اُسی میں داخل ہوتی ہے اور یہ کہ اِنسان کی زندگی دُنیا میں ایک ہی بار ہے، خواہ وہ ہزاروں سال کی ہو یا چند لمحوں کی۔

جنھوں نے یہ کہا تھا کہ آخرت میں کوئی جزا وسزا نہیں، اُن سے کہا گیا کہ کیوں نہیں؟ آخرت تو ہے ہی بدلے یعنی جزا وسزا کے لیے۔ اِنعقادِ قیامت کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے نظامِ عدل کا ایسا مشاہدہ کروایا جائے جو اُس سے پہلے چشمِ فلک نے کبھی نہ کیا ہوگا۔ ہر کسی کو اُس کے اچھے بُرے عمل کا بدلہ ملنا تقاضائے فطرت ہے اور اِس کی حرف بہ حرف تعبیر آخرت میں سامنے آئے گی۔

□□□

Marfat.com

روشنی کا سفر

روشنی نہ ہو تو انسان اندھیروں میں گم ہو جائے۔ شمس و قمر، ستارے ، سیارے کائنات کو روشن کرتے ہیں تو لوگ ایک دوسرے کو اور باقی اشیاء کو دیکھتے ہیں۔ رات کی تاریکیوں سے پردہ ہٹانے کے لیے مصنوعی روشنیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایسا نہ کیا جائے تو کچھ بھی دکھائی نہ دے کیونکہ نظر کا اصول یہی ہے کہ پہلے کوئی شے روشن ہوتی ہے، اُس سے نظر کی کرنیں پھوٹتی ہیں جو دیکھنے والی آنکھ میں داخل ہو جاتی ہیں اور دیکھنے والی آنکھ اُسے دیکھتی ہے۔ یہ بات سب سے پہلے ابن الہیثم نے سائنسی بنیادوں پر متعارف کرائی اور اِس کا انکشاف اپنی مشہور زمانہ کتاب ''روشنی'' میں کیا۔ اس اصولِ بصارت کی صداقت کا واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ اندھیرے میں پڑی کوئی شے ہمیں نظر نہیں آتی۔ یہ تو ظاہر کی دُنیا کی بات ہے، مظاہرِ فطرت کو دیکھنے کی بات، لیکن انسانی حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کا التزام بھی ہو۔ مظاہرِ فطرت کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ باطن کی دُنیا یعنی روحانیت پر بھی نظر ڈالی جائے اور یہ دل کی بات ہے۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

؎ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

انسان کی طرح ظاہر و باطن ہر شے کا ہے۔ درخت کی ایک ظاہری ہیئت ہے، درخت

Marfat.com

سایہ دیتا ہے؛ درختوں کی لکڑی جلانے اور تعمیرات کے کام آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو ہر کوئی جانتا اور سمجھتا ہے لیکن درختوں کے اور بھی بہت سے مضمرات ہیں جن کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا، صرف محققین سمجھتے ہیں۔ گویا باطن کو سمجھنے اور مضمرات کو جاننے کے لیے علم و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حقیقتِ اشیاء کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ اصل روشنی علم وحکمت اور فہم و فراست ہے۔ ''العلمُ النور''

اِسی لیے حصولِ علم انسان پر لازم ہے۔ اِنسان علم کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ علم و دانش ہی سے انسان کی فکر و نظر اور اِس کا دِل و دماغ روشن ہوتا ہے۔ علم و عرفان کا منبع اللہ کی ذات ہے اس لیے کہ وہ ہر شے کا خالق ہے۔ اُس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کا اندازہ مقرر کیا اور اُسی کا اندازہ سوفی صد صحیح ہے، جسے تقدیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''تقدیر العزیز العلیم'' سب سے زیادہ جاننے والی غالب ذات کا اندازہ۔ انسان کے پاس جتنا علم ہے وہ اُسی علم و خبیر ذات کی بدولت ہے۔ اللہ کے علم اور کلام کی بہترین مثال قرآنِ حکیم ہے جو تمام تر علوم کی رُوح اور منبع ہے۔

''الرحمن o علم القرآن o خلق الانسان'' اللہ جو رحمٰن ہے، اُسی نے قرآن کی تعلیم دی۔ اُسی نے انسان کو پیدا کیا ''علم الانسن مالَمْ یَعْلَم'' اللہ نے انسان کو علم سے نوازا، اور اسے وہ کچھ سکھایا جو یہ نہیں جانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطری اور اصل پہچان اِسی علم و معرفت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کی فضیلت و برتری کا راز بھی علم و حکمت ہی میں مضمر ہے اور انسان کے عقیدہ و ایمان اور کردار و عمل کی صحت اور نشو و ارتقاء کا انحصار بھی علم و تحقیق پر ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور علم فطرت کی پکار۔ اس لیے علم و تحقیق اسلام کا خاص عنوان ہے۔ اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ پہلی ہی وحی اس عنوان پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ اسلام ہی کی پھیلائی ہوئی علم و حکمت کی روشنی ہے جس سے دنیا کے تہذیب و تمدن اور سائنس کی راہیں جگمگائیں۔ اسلام چودہ صدیوں سے اس شجرِ علم کی آبیاری کر رہا ہے۔ روشنی کے اِس سفر میں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے۔ یہ روشنی نہ ہوتی تو انسان کا دل و دماغ تاریکیوں کی تہوں میں لپٹا رہتا اور انسان اور حیوان میں کچھ فرق نہ ہوتا۔

□□□

Marfat.com

مادیت زدہ خون کا رِشتہ

جب سے انسان پر مادیت غالب آئی ہے معاشرے کی قدریں دُھندلا گئی ہیں۔ کتابوں میں تو یہی لکھا ہوا ملتا ہے کہ احسان ومروت اور ایثار و ہمدردی انسان کی خوبی ہے جس سے معاشرے میں اخوت، محبت اور صلح وسلامتی کی فضا برپا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن جب کسی کا معیار بدل جائے تو قدریں بھی بدل جاتی ہیں اور خونی رشتوں کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔

سمندر پار کا ایک واقعہ پڑھنے کو ملا کہ ایک شخص نے اپنا فلیٹ اپنی ہی بیٹی کو کرائے پر دے رکھا تھا، وہ بے چاری ملازمت کر کے اپنا خرچہ بھی چلاتی اور فلیٹ کا کرایہ بھی ادا کرتی۔ باپ نے اُس سے کرایہ بڑھانے کا تقاضا کیا اور ساتھ ہی خبردار بھی کیا کہ اگر اُس نے کرایہ نہ بڑھایا تو وہ فلیٹ زیادہ کرائے پر کسی اور کو دے دے گا۔ بیٹی نے کچھ مہلت مانگی مگر کاروباری باپ نے اُس کی پروا کیے بغیر اُس سے مکان خالی کرا کے کسی اور کو دے دیا۔

اسے کہتے ہیں خون سفید ہونا اور جب خون سفید ہو جائے تو سب سے بڑا خونی رشتہ بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔ ایسے میں نہ ماں کی ممتا باقی رہتی ہے، نہ باپ کی شفقت، والدین اور اولاد کے درمیان فاصلے بڑھ جاتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے لیے کسی اجنبی سے زیادہ کچھ نہیں رہتے، اور پھر ایسے دِل خراش واقعات پڑھنے سننے کو ملتے ہیں۔

جس معاشرے کا یہ حال ہو وہ بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ دولت کا لالچ

Marfat.com

انسان سے بصیرت چھین لیتا ہے اور وہ دولتِ دُنیا سمیٹنے کے لیے اندھا دھند ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ پیسے کے لالچ میں جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان دولتِ دُنیا کے نشے میں بے خود ہو جائے اور مادہ پرستی اُسے انسانی قدروں اور رشتہ و قرابت کے احساس سے محروم کر دے۔

بات یہ ہے کہ اخلاقی قدروں کو جب تک مذہب کے تناظر میں نہ دیکھا جائے ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ جس بات کو اِنسان مذہبی تعلیم کے طور پر اختیار کرتا ہے اُسی کا نقش گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مذہب ہی کا اعزاز ہے کہ اُس نے اِنسان پر اخلاقی پابندیاں عائد کر کے اسے حُسنِ اخلاق و کردار سے مزیّن کیا۔ آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی بے ثباتی کو واضح کیا اور دُنیا کی زندگی کو اِنسان کے لیے آزمائش کے طور پر پیش کیا، باقاعدہ اخلاقی نظام کے تحت انسانی رویوں کو تشکیل دیا اور مسلسل یاددہانی کے ذریعے معاشرتی قدروں کی پاسداری کا پیغام دیا تاکہ زندگی اعتدال اور توازن کی سطح پر برقرار رہے۔

زندگی کی حقیقی بقا اور مقصدِ حیات کی اصل کامیابی، جسم اور رُوح، ظاہر اور باطن اور دُنیا اور آخرت دونوں کی فلاح سے عبارت ہے۔ جس طرح جڑ کے بغیر تنا نہیں، پانی کے بغیر دریا نہیں، روشنی کے بغیر دن کا تصور نہیں، اسی طرح مادیت کے بغیر رُوحانیت اور رُوحانیت کے بغیر مادیت بے حیثیت ہے۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ دونوں کا خوبصورت اِمتزاج ہو، اسی لیے تو ''فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة'' دینِ فطرت کا سلوگن ہے۔

ویسے تو دورِ جدید ترقی کا زمانہ ہے، بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی میں حیرت کا ساماں ہے۔ ''روشن خیالی'' اور ''روشن خیال اعتدال پسندی'' کے تصورات معاشرے کی اصلاح و فلاح اور صلح و آشتی کے لیے کارفرما ہیں۔ مگر جب حقیقی ہدایت کو مشعلِ راہ نہ بنایا جائے، مادیت کا غلبہ برقرار رہے گا اور بامِ عروج پر پہنچی ہوئی سائنسی ترقی کے باوجود مشینی دور میں انسانی سوچ اور رویے مشینوں ہی کی طرح انسان دوستی کے احساس سے محروم رہیں گے۔

؎ ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

□□□

Marfat.com

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا!

انسان کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف میں سے ایک وصف دوسروں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آنا ہے۔ اس عنوان کے مفہوم کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے اور نرمی اور رحم دلی کے بہت سے انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ نرم لہجے میں بات چیت کر کے بھی کیا جا سکتا ہے اور باہمی معاملات میں نرمی اختیار کر کے بھی، نیز کسی کا قصور معاف کر کے بھی اور کسی کا مؤقف تحمل سے سن کر بھی۔

فطری طور پر ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس پر سختی نہ کی جائے، اس سے درگزر کیا جائے، اُس کی چھوٹی موٹی کوتاہیوں سے چشم پوشی کی جائے۔ چونکہ معاشرتی زندگی باہمی معاملے، رابطے اور تعلق کا نام ہے لہٰذا ہر شخص پر یہ احساس لازم ہے کہ وہ خود بھی دوسروں کے لیے اپنے مزاج میں نرمی، شگفتگی اور رحم دلی پیدا کرے، تاکہ دوسرے بھی اُس کا لحاظ کریں۔

سب سے مشکل کام دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنا اور انھیں اپنی بات کا قائل کرنا ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ حالات بھی سخت مخالف ہوں اور کوئی بھی بات سننے کو تیار نہ ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انبیائے کرامؑ کا مشن سب سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے کہ ایک طرف دعوتِ حق اور دوسری طرف ہر کوئی مخالف، مگر استقامت اور نرم خوئی کی بدولت لوگ بالآخر بات سننے پر آمادہ ہو ہی گئے اور انبیا کرامؑ کا مشن آخر کار ''شریعتِ محمد ﷺ'' کی شکل میں اپنے تمام تر تقاضوں کے ساتھ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ اس بے مثال کامیابی میں رسول اللہ ﷺ کے نرم رویے اور حُسنِ اخلاق کا اس

Marfat.com

قدر دخل ہے کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ اِس کو بیان کیا کہ اگر آپ ﷺ نرم دِل ہونے کی بجائے تند خو اور سخت مزاج ہوتے تو لوگ آپ سے دُور بھاگ جاتے۔ نبی ﷺ کی رحم دلی تو ضرب المثل ہے۔ آپ کو سب سے زیادہ شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ہمیشہ رواداری، درگزر، تحمل مزاجی اور نرم خوئی کا مظاہرہ کیا۔ کبھی کسی سے اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ ہمیشہ دوسروں کے قصور معاف کیے۔

حضرت انسؓ کو مسلسل دس سال حضورِ اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں رہنے کا شرف حاصل رہا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس پورے عرصے میں ایک مرتبہ بھی آپ ﷺ نے ان کو جھڑکا نہیں۔ آپ ﷺ ہمیشہ ماتحتوں اور کمزوروں کا بہت خیال رکھتے، ان کے حقوق ادا کرنے کی تلقین فرماتے رہے اور مہربانی سے پیش آنے کی تعلیم دیتے رہے۔ فرمایا: مخلوق پر رحم کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔ جو رحم نہیں کرتا اُس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ معاشرتی حوالے سے اس رویے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن ہمیں اس کا یوں بھی احساس دلاتا ہے کہ تم لوگوں کو معاف کر دیا کرو، اُن سے نرمی سے پیش آیا کرو کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے، تم پر مہربانی کرے۔

اسلام تو نرم خوئی اور مشفقانہ طرزِ عمل کا اس قدر حامی ہے کہ جانوروں تک کے ساتھ اچھے سلوک پر زور دیا گیا ہے۔ ایک بلبلاتے ہوئے بے قابو اُونٹ نے حضور ﷺ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ وہ اپنے مالک کی شکایت کر رہا تھا، جو اُس سے مشقت تو لیتا ہے مگر ضرورت کا خیال نہیں رکھتا۔ پھر آپ نے اُونٹ کے مالک کو بلوا کر ہدایت کی کہ وہ اپنے جانور کا خیال رکھے۔ حیوانات پر رحم و کرم کے حوالے سے سیرتِ نبوی ﷺ میں اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جو مذہب جانوروں تک کے بارے میں حد درجہ احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھے، انسانوں کے بارے میں اس کی تعلیمات میں کس درجہ حساسیت ہوگی!

اس رویے کی انسان کو فی زمانہ ضرورت ہے۔ نرم خوئی، رحم دلی اور رواداری کی ضرورت ہے تا کہ افرد کا، اقوام کا باہمی رابطہ مضبوط ہو اور افہام و تفہیم کے ماحول میں معاشرے کی ترقی، خوشحالی اور تعاون کا عمل جاری رہے۔ کشیدگی سے پاک ماحول ہی ترقی کا ضامن ہے۔ اس راہ میں اسلام قدم قدم پر ہمارا راہنما ہے۔ اس کی تعلیم ہر شعبۂ زندگی کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

□□□

Marfat.com

بے قصور کو ظالم کے حوالے کرنا بھی ظلم ہے!

کفار نے جناب ابوطالب کو بار بار کہلا بھیجا کہ وہ اپنے بھتیجے کو روکیں۔ اُس کی سرگرمیاں ہمارے مفادات اور''set-up'' کے خلاف ہیں۔ وہ ہر بار اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر واپس کرتے رہے، لیکن کفار کی تشویش بڑھتی رہی اور بالآخر ایک بہت ہی نازل مرحلہ آ گیا، جب ان کی طرف سے پہلے سے شدید مطالبہ سامنے آیا۔ ان کا ایک وفد حضرت ابوطالب سے ملا اور دو ٹوک انداز میں مطالبہ کیا کہ وہ یا تو اپنے بھتیجے کو باز کرلیں یا ان کے حوالے کردیں تا کہ وہ جو چاہتے ہیں اُسے عملی جامہ پہنا سکیں۔

جناب ابوطالب کے لیے یہ کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف جان سے زیادہ عزیز ذات، جس کے بارے میں وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس کی امانت و دیانت اور صداقت و شرافت میں کوئی شبہ نہیں۔ جس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک حرف دِل میں گھر کر جانے والا، جس کے مؤقف کو تسلیم کیے بغیر دِل کو قرار نہ آئے اور دوسری طرف کفار و مشرکین کہ جن کی ہر بات بے دلیل اور بے وزن اور عزائم ہٹ دھرمی پر مبنی تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ سچائی ہی اصل طاقت ہے جو اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ کافر کی زبان لاکھ انکار کرے، دل اُس کا بھی سچ ہی کا حامی ہوتا ہے۔ بدترین دُشمنِ اسلام ابوجہل، رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتا تھا کہ میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا۔ جناب ابوطالب کی پیغمبرِ اسلام ﷺ کے لیے حمایت اور

Marfat.com

طرف داری کے حوالے سے خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ چنانچہ انھوں نے قریش کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا، حق وصداقت کا ساتھ دیا۔ ہر حال میں حمایتِ حق جاری رکھنے کا اعلان کیا اور رسول اللہ ﷺ کو مشرکین کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

ایمان دار لوگ مشرکینِ مکہ کے مظالم سے تنگ آ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں حبشہ جانے کی اجازت دے دی۔ کچھ لوگ وہاں چلے گئے اور آرام سے رہنے لگے۔ مشرکین نے اِسے بھی برداشت نہ کیا اور مسلمانوں کی واپسی کے لیے حکومتِ حبشہ سے رابطہ کیا۔ مگر عیسائی بادشاہ انصاف دوست اور خدا ترس نکلا کہ اُس نے معاملے کی تحقیق کرنا مناسب سمجھا اور جب پتہ چلا کہ اسلام اور عیسائیت کی بنیادی تعلیمات ایک ہی ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کا مؤقف ہی درست ہے، تو اُس نے کفار کا مطالبہ رد کر دیا، ان کے تحائف واپس کر دیے اور مسلمانوں کو اُن کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ نجاشی نے اپنی حقیقت پسندی کا اگلا ثبوت یہ دیا کہ کچھ عرصہ بعد اسلام بھی قبول کر لیا۔

بات یہ ہے کہ کسی بے گناہ کو ظالم کے حوالے کرنا بھی ظلم ہی کا ایک انداز ہے۔ انداز بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ مسلمان نہ تو مسلمان پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اُسے ظالم کے حوالے کرتا ہے۔ بالخصوص جب ظالم باطل کا پجاری اور کفر کا نمائندہ بھی ہو!

انسان شروع سے امن وسکون کا متلاشی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ امن کی ضرورت و اہمیت کا احساس شدید تر ہو گیا ہے۔ معاشرے کا استحکام صلح وسلامتی اور امن و آشتی کا مرہونِ منت ہے اور امن کی یقینی ضمانت صرف اللہ کے قانون میں ہے جس کے نزدیک انسان بہت محترم ہے اور اُس کے ساتھ کوئی بھی ظلم ناروا ہے۔ یہ قانون حق تلفی کی مذمت کرتا ہے، شر اور شر پسند عناصر کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اِس قانون اور ضابطے کا اپنا ایک اخلاقی معیار ہے جس کی رُو سے ہر فرد دوسرے کی خیر خواہی کا پابند ہے۔ خبردار کیا گیا ہے کہ ہر مسلمان کا خون، مال اور اُس کی عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ خیر خواہی کا یہ جذبہ صرف مسلمانوں تک نہیں بلکہ پوری نسلِ انسانی کے لیے ہے۔

نسلِ انسانی کو بدامنی کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے مجرموں اور شر پسندوں کی تلاش فی زمانہ وقت کا تقاضا رہی ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک کا گناہ دوسرے کے سر نہ آئے اور کوئی بے قصور ظلم کا نشانہ نہ بن جائے۔

Marfat.com

قانون ہوتو سب کے لیے!

تاریخ بتاتی ہے کہ بیٹے نے اس غرور میں کہ وہ قاضیٔ وقت کا بیٹا ہے، کسی غریب زادے کو حقیر سمجھتے ہوئے مارا پیٹا اور اُس کی بہت توہین کی۔ وہ غریب آدمی فریاد لے کر اُسی قاضی کی عدالت میں چلا گیا، شکایت بیان کی اور انصاف مانگا۔

قاضی نے اُسی وقت اپنے بیٹے کو عدالت میں طلب کیا۔ جب وہ آ گیا تو مظلوم سے کہا گیا کہ وہ اُسی چیز کے ساتھ اور اُتنے ہی زور سے اُسے پیٹے۔ چنانچہ مظلوم نے بید کی چھڑی سے اپنا بدلہ لیا۔ وہاں موجود سب لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ کس طرح ایک باپ نے اپنے ہی بیٹے کو انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا اور کس طرح ایک حقدار کو اُس کا حق دلوایا۔ سچ ہے قانون کے سامنے سب برابر ہیں، اپنا ہو یا غیر، بشرطیکہ فیصلہ کرنے والا انصاف پسند ہو۔ یہ شخص محمد بن ابی عامر تھے جو اندلس کے اسلامی عہد میں قرطبہ کے چیف جسٹس تھے، جنھوں نے بیٹے کی شدید محبت کے باوجود قانون کی حکمرانی کو مقدم رکھا اور انصاف کے تقاضے پورے کیے۔

یہی وہ نازک مرحلہ ہوتا ہے جب بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، حق و انصاف کے دعویدار جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ کس قدر مشکل ہے اپنے خلاف گواہی دینا، اپنی اولاد کے خلاف انصاف پر مبنی فیصلہ کرنا، مگر اصل جوانمردی، شجاعت اور بلند کرداری تو یہی ہے کہ کسی کے پاس اختیار ہو اور وہ اُس کے صحیح استعمال میں کسی کوتاہی یا کمزوری کا ارتکاب نہ کرے۔

Marfat.com

ظالم اور مظلوم اُن لوگوں کے لیے کڑی آزمائش ہوتے ہیں جن کے پاس فیصلے کرنے کا اختیار ہو۔ مظلوم کوئی بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی جسے کوئی ذاتی طور پر سخت ناپسند کرتا ہے۔ اسی طرح ظالم کوئی بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی جسے کوئی بہت چاہتا ہو۔ لیکن اگر ذاتی پسند و ناپسند کو فیصلے کی بنیاد بنا لیا جائے تو انصاف ناپید ہو جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو نفرت جنم لیتی ہے، عدل و انصاف کے تصوّر پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ بے یقینی اور بداعتمادی کی فضا میں گھٹن، کشیدگی اور اضطراب کا احساس بے شمار قسم کے پیچیدہ مسائل کا باعث بنتا ہے۔

اسی لیے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ کسی کی دُشمنی تمہیں ظلم اور حق تلفی پر آمادہ نہ کرے۔ تاریخ نے صرف ان لوگوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جو حق و انصاف کا بول بالا کر گئے۔ کسی کی دشمنی، کسی کی دوستی، کوئی لالچ اور کوئی دھمکی ان کے راستے میں حائل نہ ہوسکی۔ تلوار کی دھار کا یہ سفر مشکل تو بہت ہے، مگر یہی راستہ عزت، عزیمت اور عظمت کا راستہ ہے، سرخروئی کا راستہ، اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایسے عادل حکمران اور قاضی عرشِ الٰہی کے سائے میں جگہ پائیں گے۔

حق و انصاف تقاضائے فطرت ہے اور فطرت سے انحراف ہمیشہ خرابی پر منتج ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو انصاف اور قانون کی بالادستی اور حکمرانی پر دلالت کرتے ہیں۔ جو فی زمانہ سبق آموز واقعات ہیں۔ ان کی روشنی میں یقیناً اس عنوان کی اہمیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے اور معاشرے کی خرابیوں کو دُور کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

آج بھی بہت سے لوگ انصاف سے محروم ہیں، حقوق سے محروم ہیں، ان کی حالتِ زار ایک سوالیہ نشان ہے حقوق و انصاف اور عدل و مساوات کے علمبرداروں کے لیے، دُنیا کے ایوان ہائے اقتدار کے لیے! ہادیٔ اعظم ﷺ نے ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت فرمایا تھا کہ تم سے پہلی قومیں اسی لیے تباہ و برباد ہوئیں کہ ان کے امراء کے لیے قانون اور جب کہ کمزوروں کے لیے اور تھا۔ آپ ﷺ نے جس بے لاگ انصاف کی بنیاد رکھی اور عوام الناس کے لیے حقوق کی فراہمی کو یقینی بنایا، دُنیا کا کوئی نظامِ عدل اُسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اُسی کی رُوح اور روشنی جب تک ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معمولات میں کارفرما نہیں ہو جاتی، تب تک قانون کی حکمرانی اور انصاف کے حقیقی ثمرات کا حصول محض خواب رہے گا۔

□□□

Marfat.com

قُولُوالِلنَّاسِ حُسْنًا

آدمی کی پہچان اُس کے حلقۂ احباب سے بھی ہوتی ہے اور اخلاق واطوار سے بھی۔ اخلاق کی تربیت وتشکیل میں بنیادی کردار زبان اور گفتگو کا ہے۔ زبان سے بات نکلتی ہے، داستان بن جاتی ہے، ضبطِ تحریر میں آتی ہے، زبان زدِ عام ہو جاتی ہے۔ کچھ باتیں دوسروں کو اچھی لگتی ہیں، کچھ بہت اچھی اور کچھ بہت بُری اور ناگوار گزرتی ہیں۔ اس مرحلے پر الفاظ کا انتخاب ضروری ہو جاتا ہے۔ اس اَمر کی ضرورت کا احساس کہ زبان سے جو کچھ بھی صادر ہو اچھا ہو، حسن وخوبی سے آراستہ ہو۔ زبان تو زبان ہے، اس کا استعمال انسان کے اختیار میں ہے۔ اچھی بُری بات کا اِنحصار خود انسان پر ہے۔

کہتے ہیں کہ سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ ہاں! ہوتی تو ہے مگر اس کی کڑواہٹ عارضی ہے جب کہ بعد میں فائدہ ہی فائدہ۔ سچ کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے، اُس میں دلیل کا وزن جو ہوتا ہے، جسے بالآخر سب کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ بات سے بات نکالنا اور نکتہ آفرینی کرنا بھی فن ہے، مگر قابلِ تحسین صرف اُس وقت تک کہ اُس میں دوسروں کی دلچسپی کا سامان باقی رہے۔ ذرا سی بات کو محض زیبِ داستاں کے لیے بڑھا دینا بھی پسندیدہ عمل نہیں۔ اگر کوئی برائی کی نشاندہی اور مذمت کرتے ہوئے زمین وآسمان کے قلابے مِلا دے مگر اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش نہ کر سکے تو ایسی گفتگو بھی کسی کام کی نہیں۔ بات برائے بات کا کوئی خاص فائدہ نہیں، سوائے اس

Marfat.com

کے کہ کسی کو وقتی طور پر جذباتی کر دیا جائے۔ اِس کا خوش کُن تاثر دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔

باتیں کرنا انسان کا وصف ہے۔ اسی لیے تو اسے حیوانِ ناطق بھی کہا گیا یعنی بولنے والی مخلوق۔ یہ درست ہے کہ ہر مخلوق اپنے ہم جنس سے مانوس ہوتی ہے، اُس کی زبان شناس ہوتی ہے، مگر قدرت نے جو خاصیت اور تاثیر انسان کے زبان و بیان میں رکھی ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ اس کے کرشمے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اسی کی بدولت معاشرے میں انسان کا انسان سے رابطہ اُستوار ہوتا ہے، معاشرے کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ گویا معاشرے میں انسان کی گفتگو بہت اہم ہے۔ اس انتہائی اہمیت کے پیشِ نظر، بات کرنے میں احتیاط ناگزیر ہے تاکہ تمام امور و معاملات خوش اسلوبی سے انجام پائیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ اچھی اور عمدہ بات وہ ہوتی ہے جو مختصر، مدلل، سچائی کی آئینہ دار اور مبالغہ آمیزی سے پاک ہو۔

معاشرے کا ایک بڑا مسئلہ امن و امان ہے۔ اس میں بھی زبان ہی کا بنیادی کردار ہے۔ امن و سلامتی کا راستہ، اسلام دکھاتا ہے اور اس راہ کے مسافر کو قدم قدم پر حُسنِ گفتار کی تلقین کرتا ہے۔ اور مسلمان ہونے کو اس بات کے ساتھ بھی مشروط کرتا ہے کہ وہ بولے تو کلمۂ خیر ورنہ خاموش رہے۔ اپنی گفتگو سے کسی کی دلآزاری نہ کرے، دوسروں کے جذبات مجروح نہ کرے۔ ''قولوا للنّاس حُسنًا'' کی تعلیم اپنے اندر ایسا جامع فلسفہ لیے ہوئے ہے جو امن اور اتحاد کا بھی ضامن ہے۔

حُسنِ کلام ایسی معاشرتی قدر ہے جو بہت سی بھلائیوں کا باعث ہے۔ اس ''قدر'' سے محروم معاشرہ بہت سی اچھائیوں سے محروم رہتا ہے۔ بات کرتے وقت موزوں الفاظ کا انتخاب یعنی کلمۂ خیر، نفرتوں، اُلجھنوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا ہے اور ماحول کو خوشگوار بناتا ہے۔ اسی لیے تو کلمۂ خیر کو صدقہ بھی قرار دیا گیا یعنی اچھی بات کرنے کا فائدہ صرف دُنیا میں نہیں، بلکہ اس کا فائدہ اور ثواب آخرت میں بھی ہے، جو زیادہ مستقل اور پائیدار ہے۔ اچھی اور عمدہ گفتگو طاقت ہے جو دلوں کو فتح کرتی ہے، ایک روشنی ہے جو نفرت کے اندھیرے دُور کرتی ہے، محبت کو عام کرتی ہے۔ بولنے والی مخلوق کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ اُس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ غیر ضروری طوالت، مبالغہ آمیزی اور دلیل کے فقدان سے بے وزن نہ ہو جائیں۔

□□□

Marfat.com

آزادی کیا ہے؟

ہمارے ہاں رواج سا ہو گیا ہے کہ بڑے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں مگر اُن کی صداقت کو ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ نعرہ لگا دیا جاتا ہے مگر اُس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ دعویٰ، دعوے کی حد تک اور نعرہ، نعرے کی حد تک محدود ہو کر زبان زدِ عام ہو جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی کافی ہے، گویا بات برائے بات کہ جس کا آگے پیچھے کوئی مقصد نہ ہو۔

ایسے ہی ایک دعویٰ یا نعرہ آزادی کا ہے۔ آزادی ہر کسی کی فطری خواہش بھی ہے اور اُس کا حق بھی۔ قوموں کی تاریخ میں آزادی بہت اہم عنصر ہے، اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ جس قوم نے بھی غلامی سے آزادی تک کا سفر کیا اُس نے بہت بھاری قیمت ادا کی۔ قربانیوں کی لازوال داستان رقم کرنے کے بعد آزادی نصیب ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ آزادی ہے کیا؟ کیا پابندیوں کو قبول نہ کرنے کا نام آزادی ہے؟ کیا حکم عدولی یا قانون شکنی کا نام آزادی ہے؟ اگر آزادی سے یہی مراد ہے کہ کوئی جو بھی کرنا چاہے اُس پر کوئی پابندی نہ ہو، قطع نظر اس کے کہ وہ اچھا کرنے جا رہا ہے یا بُرا۔ اُس کی خواہش کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو، خواہش اچھی ہو یا بُری، تو یہ بہر حال لمحہ فکریہ ہے۔ اس رُجحان سے کوئی بھی معاشرہ بے راہ روی اور انتشار کی لپیٹ میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

Marfat.com

دُنیا کا کوئی بھی نظامِ اخلاق یا علم سیاسیات ایسے رجحان کو آزادی کا نام نہیں دیتا۔ یہ تو سراسر ذہنی آوارگی اور بے لگامی ہے کہ کسی 'Check & Balance' کے بغیر کوئی جو جی میں آئے کرتا رہے۔ دینِ فطرت تو اِسے بے حیائی سے تعبیر کرتا ہے۔ وضاحت یوں کی گئی ہے کہ ''اِذَا فاتك الحیاء فافعل ماشِیئتَ'' گویا جب شرم و حیا مفقود ہو جائے تو بے راہ روی عام ہو جاتی ہے۔ علمی لحاظ سے تو آزادی ایک جامع اصطلاح اور تصوّر ہے جس کے لیے با قاعدہ لوازمات اور شرائط مقرر ہیں۔ مختصر طور پر اس سے مراد ایسا ماحول ہے جس میں لوگ بحیثیت قوم اپنی نظریاتی شناخت برقرار رکھ سکیں، اُن کے تمام بنیادی حقوق کو یقینی تحفظ فراہم ہو، وہ کسی بے جا پابندی کے بغیر اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو مثبت اور تعمیری انداز میں بروئے کار لا سکیں، جہاں اچھائی اور اچھے لوگوں کی قدر افزائی ہو، برائی اور بُرے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ جہاں عدل و انصاف ہو، قانون کی حکمرانی ہو، احترامِ انسانیت ہو۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے تصوّرِ آزادی کو اس کے لغوی و اِصطلاحی مفہوم سے آزاد سمجھ رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے اندر بہت سی قباحتوں نے جنم لیا اور آزادی کے باوجود مطلوبہ ترقی و خوش حالی اور شایانِ شان عظمت و وقار کے لیے ہماری آنکھیں ابھی تک فرشِ راہ ہیں۔ آزاد ہو کر بھی جہالت، غربت اور فرقہ واریت سے آزاد نہیں ہو سکے۔ حالانکہ آزادی ان مسائل اور المیوں سے نجات پانے کا نام بھی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ وطنِ عزیز کی آزادی کی تحریک مسلسل قربانیوں کی داستان ہے جو جوانوں کے خون کی شہ سرخیوں، عزت و ناموس کے حوالوں، شیر خواروں کے لہو کے نذرانوں سے عبارت ہے۔ کاش کہ ہم جان سکتے کہ آزادی یہ نہیں کہ اخلاقی ضابطے اور حدود و قیود سے آزاد ہو کر سڑکوں بازاروں میں گھومتے پھریں، رقص و سرود سے دِل بہلاتے رہیں، والدین اور اساتذہ کا احترام کرنا چھوڑ دیں، بے ہودہ اور نقصان دہ مشاغل اختیار کر لیں، بلکہ آزادی تو روشنی ہے جس سے اچھے بُرے میں تمیز ہوتی ہے۔

□□□

Marfat.com

ڈوبتے کو سہارا چاہیے!

کہتے ہیں کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ہر کمزور اور بے بس و ناتواں جان کو سہارا چاہیے۔ ہر کمزور کو کسی طاقتور کا سہارا، ہر بے اختیار کو کسی با اختیار کا سہارا، ہر جاہل کو کسی عالم کا سہارا، ہر غافل کو باشعور اور خبر دار کا سہارا، ہر چھوٹے کو بڑے کا سہارا، ہر جز و کو کُل کا سہارا۔ جس جس کو جو جو سہارا چاہیے اُس کا وجود اُس سہارے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بالکل فطری سی بات ہے۔

جب کوئی کسی پریشانی اور مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو نجات کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ مصیبت سے رہائی کے لیے راستہ تلاش کرتا ہے۔ ایسے میں وہ طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ کوئی ہو جو اُس کا ہاتھ تھام لے۔ عام حالات میں جسے وہ بہت حقیر سمجھتا ہے، پریشانی کے عالم میں اُس سے بھی اُمید وابستہ کر لیتا ہے کہ شاید وہ ہی اُس کی نجات کا سامان بن جائے! گویا ڈوبتا ہوا شخص ہر طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اپنی دانست میں ہر شے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ وہ ایک تنکا ہی کیوں نہ ہو، تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ڈوبنے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

انسان کی کمزوری کئی طرح کی ہوتی ہے۔ فکری و عملی، جسمانی، مالی اور قانونی کمزوری/مجبوری وغیرہ۔ بے بس اور بے اختیار ہونے کی کمزوری، اسباب و ذرائع سے محرومی بھی کمزوری ہے۔ جہالت اور ذہنی پسماندگی بہت بڑی کمزوری ہے۔ غفلت اور بے خبری کمزوری ہے۔ ہر الگ تھلگ اور منتشر جزو کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ گویا ''خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا''

Marfat.com

یعنی انسان فطرتاً وطبعاً کمزور واقع ہوا ہے۔ اس لیے اِسے ہر حال میں کسی قوت وطاقت کے ساتھ وابستگی کی ضرورت ہے۔ ایسی طاقت جو عارضی اور موسمی نہ ہو بلکہ ہمہ جہت وہمہ گیر اور مستقل ہو۔ جو عادلانہ اور غیر جانبدارانہ ہو، ہر لحظہ وہر آن خبردار ہو، آزاد اور خود مختار طاقت کہ جس کا انحصار کسی اور پر نہ ہو، وہ کہ جس کو وہ بچانا چاہے صرف وہی بچے۔

ایک ایسے شخص کو دیکھئے جو لوگوں کے سامنے گہرے پانی میں گرا اور ڈوبنے لگا۔ لوگ اُسے بچانے کے لیے دوڑے، بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، مگر کسی کا بس نہ چلا۔ ڈوبتے ہوئے کو بچانے کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سامنے ڈوب جاتا ہے۔ دیکھنے والے افسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔

دوسری طرف ایک ایسا ڈوبتا ہوا شخص ہے جسے بچانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ تند وتیز طوفانی لہروں کے رحم وکرم پر ہے۔ بچنے کا بظاہر کوئی راستہ، کوئی اِمکان نہیں۔ اُس کی آنکھوں میں سوائے حسرت ویاس کے کچھ بھی نہیں۔ منہ زور لہروں کے تھپیڑے اُسے اُٹھا اُٹھا پھینکتے ہیں، ڈبکیاں کھاتا ہے، مگر زندہ رہتا ہے اور بچ بچا کر کنارے لگ جاتا ہے۔

آخر کون ہے؟ جو بچانے والوں کی سب تدبیریں ناکام بنا دیتا ہے اور بہت سے ظاہری اسباب کے ہوتے ہوئے ایک شخص ڈوبنے سے نہیں بچ پاتا اور ایک وہ جو بظاہر ہر طرح سے بے سہارا دکھائی دیتا ہے، بے یار ومددگار ہے مگر بچ نکلتا ہے۔ یقیناً کوئی تو خفیہ طاقت ہے جو بہت زبردست ہے، سب پر حاوی ہے۔

وہی اصل طاقت ہے، سب طاقتوں پر حاوی، قوت وطاقت اور اختیار واقتدار کا حقیقی سرچشمہ، صحیح معنوں میں سپریم پاور! وہی جس نے زمین وآسماں بنائے، شمس وقمر، ستارے اور سیارے روشن کیے۔ جس نے ہوا اور پانی کو پیدا کیا، جس نے زمین کے سینے کو جمادات ومعدنیات کے ذخائر سے معمور کر دیا، جس نے کرۂ ارض کو نوع بہ نوع نباتات سے مزین کیا۔ جس نے انسان کو پیدا کیا اور پوری کائنات کو اِس کے لیے مسخر کر دیا۔ وہی غیبی طاقت ہے جو سب سے بڑی صداقت ہے۔ جس کو تسلیم کرنا ہی انسان کے سچا ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ وہی سب سے بڑا اور سب سے مضبوط سہارا ہے۔ اُسے تھامے بغیر کوئی بھی ڈوبنے سے نہیں بچ سکتا۔

□□□

Marfat.com

اِجتماعی اخلاقی قدرِ مشترک

قومی تشخص وہ معیار ہے جو کسی قوم کی الگ اور منفرد شناخت قائم کرتا ہے۔ وہی معیار اُس قوم کا مرکز و محور ہوتا ہے، اس کی تمام تر توجہ اور فکر و عمل کا محور! جس طرح کسی درخت کی زندگی اس کی جڑ سے وابستہ ہے۔ چھت کا انحصار ستونوں پر ہے۔ پھول کی خوبصورتی اور دلکشی رنگ و بُو سے ہے، کامیابی محنت سے مشروط ہے۔ جڑ کٹ جائے تو ہرا بھرا درخت محض ایک سوکھی لکڑی رہ جاتا ہے۔ ستون نہ رہیں تو چھت زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا! اسی طرح قومی تشخص سے الگ ہو کر قوموں کا اجتماعی وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں مرکز سے جدائی کا مطلب موت ہے، زوال ہے۔

قوموں کے الگ الگ تشخص کے ساتھ ساتھ تمام اقوامِ عالم کا ایک مشترک اجتماعی تشخص بھی ہوتا ہے جو اخلاقی قدروں سے تشکیل پاتا ہے۔ مثال کے طور پر سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا اور شرم و حیاداری وغیرہ۔ اس طرح کی باتیں وہ اِنسانی اخلاقی قدریں ہے جو کسی ایک قوم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر قوم کے ضابطۂ اخلاق میں شامل ہیں۔ بنیادی طور پر ہر قوم کو زندگی گزارنے کے لیے ہدایت کا سامان ربِ کائنات کی طرف سے فراہم کیا گیا جس کی مبادیات یکساں ہیں اور کوئی مذہب اِس کے خلاف تعلیم نہیں دیتا۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ انحراف کر جائیں اور ان قدروں کے خلاف رویے اپنالیں۔ اس سے کسی مذہب اور اُس کے نظامِ اخلاق کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔

Marfat.com

اصل میں انسان کا امتیازی مقام و مرتبہ اور اس کی عظمت کردار کی بنیاد ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ اسی لیے مذاہبِ عالم نے اِن کو اُجاگر کیا اور اِن کو اپنانے پر زور دیا۔

ہر مذہب میں اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان حلال وحرام اور اچھائی و برائی میں تمیز کرے۔ اچھائی کے طور پر شرم وحیا کو اختیار کرے اور فحش باتوں کو بُرا سمجھتے ہوئے ترک کر دے۔ حیاداری تقاضائے فطرت ہے جب کہ اس کے برعکس رویہ خلافِ فطرت۔ شرم وحیاداری وہ پاکیزہ وصف ہے جس کے تحت انسان اپنی زبان، اپنے ہاتھوں اور جذبات پر قابو پاتا ہے اور ان کا صحیح اور مناسب استعمال کرتا ہے، انسان اور حیوان کا فرق سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو انسانی اوصاف سے مزین کرتا ہے اور خواہشِ نفس کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنا امتیاز برقرار رکھتا ہے۔ وہ اپنی زبان کو فحش اور بے ہودہ گفتگو سے آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ اپنے کردار کو اخلاقی بے راہروی اور جنسی آوارگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ دینِ فطرت میں حیاداری اس قدر اہم عنوان ہے کہ اسے جزوِ ایمان قرار دیا جاتا ہے۔

ایک پاکیزہ اور صاف ستھرے معاشرے کے قیام کے لیے حیاداری کے فروغ کی ضرورت ہے۔ یہ بات انسان پر باہر سے مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ اِس کا تعلق اِنسان کی رُوح اور اس کے ضمیر سے ہے۔ حیاداری کا چشمہ اندر سے پھوٹتا ہے، اِس شعور کے ساتھ کہ کسی کو اپنے انسان ہونے کا قوی احساس ہو۔

اِنسان کی مخصوص وضع قطع اور لباس بھی حیاداری کے تقاضوں میں سے ہے۔ حیوان کو لباس کی ضرورت نہیں، یہ صرف انسان کے لیے ہے۔ لباس انسان کی فطری، طبعی اور اخلاقی وتہذیبی ضرورت ہے۔ کوئی بھی مذہب اس کے خلاف تعلیم نہیں دیتا۔ پتھر کے زمانے کا اِنسان بھی لباس زیب تن کرتا تھا، نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے۔

شیطان چاہتا ہے کہ اِنسان لباس کے معاملے میں بھی لاپرواہ ہو جائے تا کہ حیاداری کے تقاضے مجروح ہوں اور فحاشی کا راستہ کھل جائے۔ یہ بات شیطان کے لیے تو خوشی کا باعث ہے کہ وہ انسان کا بدترین دُشمن ہے لیکن اس کی اِس خوشی میں اِنسان کے احساس اور ضمیر کی موت مضمر ہے۔

□□□

Marfat.com

تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ!

رُشد و ہدایت اِنسان کی اوّل و آخر ضرورت ہے۔ مخلوق کے لیے بہترین اور جامع ہدایت وہی ہو سکتی ہے جو اُس کے خالقِ برحق کی طرف سے ہو۔ کیونکہ خالق سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا کہ اُس کی مخلوق کے کیا تقاضے ہیں؟ خالقِ برحق اللہ وحدہ لاشریک کی ذات ہے۔ لہٰذا اصل ہدایت صرف اُسی کی طرف سے ہے جو نسلِ انسانی کو حقیقی فلاح سے ہمکنار کرنے کی صلاحیت سے بھرپور ہے۔ ''قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى''

یہ ہدایت الہامی ہے جو انبیائے کرامؑ کی معرفت ہر دور کے انسان کو فراہم کی جاتی رہی۔ ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' ''وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْر'' ''وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْل'' الہامی سلسلۂ رُشد و ہدایت بہت طویل اور انتہائی عظیم الشان ہے جس کی آخری کڑی بعثتِ محمدی ﷺ ہے۔ ہدایت کا نقطۂ عروج جس کا ماخذ و منبع قرآن ہے۔

قرآن کا موضوع انسان اور اس کی فلاح ہے۔ قرآن میں کوئی ۶۵ مقامات پر لفظ انسان آیا ہے۔ اِنس اور ناس کے الفاظ اِس کے علاوہ ہیں۔ یہ صحیفۂ ہدایت انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور اس کے کامیاب نشو و ارتقاء کے لیے جامع راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اِصلاحِ عقیدہ سے لے کر کردار و عمل کے ایک ایک گوشے تک کے لیے حق و صداقت پر مبنی راہنمائی صرف قرآن سے ملی، جس نے بتایا کہ سب انبیائے کرامؑ کا مقام اور مرتبہ محترم ہے، معتبر

Marfat.com

ہے۔سب پر ایمان لانا ناگزیر ہے۔اُن میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' قرآن ہی بتاتا ہے کہ نبیؑ جس قوم کی طرف بھی بھیجا گیا اُس قوم پر اُس نبیؑ کی اطاعت لازم ٹھہری ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰه''

قرآن وضاحت کرتا ہے کہ سلسلۂ رُشد و ہدایت مکمل ہو جانے کے بعد آنے والے ہر دور کے انسان پر صرف اُس ذات کی اطاعت لازم رہ گئی جس پر اللہ نے ہدایت اور دین کی تکمیل کی۔اس میں حیرت یا پریشانی کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ تو قانونِ فطرت اور تکمیلِ ہدایت کا لازمی تقاضا ہے۔

''هُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ''

کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ رسالت مآب محمد رسول اللہ کو اللہ کے آخری نبی کی حیثیت سے نہیں مانتا اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کے تابع نہیں ہو جاتا۔نیز جب تک وہ تمام نبیوں پر اُسی طرح ایمان نہیں لاتا جس طرح اُس کا ایمان محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ہے۔

دینِ فطرت کی رُو سے تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے ایمان و عمل کا یہی معیار ہے۔کسی بھی مذہب کی پیروی کے دعویدار پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اُس مذہب کو جس نبیؑ کے ساتھ منسوب کرتا ہے،اس پر ایمان بھی لائے اور اُس کی ہر بات بھی مانے،اُس کی دی ہوئی تعلیم پر عمل کرے۔تحقیق سے ثابت ہے کہ تمام انبیاء کرام کی مشترک تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ رہی ہے کہ آخری نبی پر ایمان لانا اور اُس کے پیغام پر عمل کرنا ضروری ہے۔

مذاہب کے درمیان مکالمے کی کامیابی کا انحصار اِسی بنیاد پر ہے۔توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ سب نبیوں پر یکساں ایمان لایا جائے۔سب کو سچا مانتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔یہ مان لیا جائے کہ وہ سب مبعوث من اللہ ہیں۔یہ مان لیا جائے کہ اللہ کا دین شروع سے آخر تک ایک ہی ہے۔''اِنَّ الدین عنداللّٰه الاسلام''اور یہ بھی مان لیا جائے کہ ہر نبیؑ نے اپنے بعد مبعوث ہونے والوں کو آخری نبی کی بعثت کی خبر دی جو مذاہبِ عالم کی تعلیمات میں اب بھی موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ الہامی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے جو حقیقی روشنی اور فلاح کی ضامن

Marfat.com

ہے۔ بشرطیکہ اِسے من وعن تسلیم کیا جائے۔ اس احساس کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کے احکام وقوانین اور فیصلوں کو تسلیم کیے بغیر چارہَ کار نہیں۔ اللہ کے ضابطۂ ہدایت میں ترمیم واضافہ روانہیں۔ قرآن کا ہر دور کے اِنسان سے یہ سوال ہے۔ ''ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ'' لوگو! تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ دعوتِ فکر ہے ہر ذی شعور کے لیے!

□□□

Marfat.com

طوطے کا پیغام

آزادی کی خواہش اور تڑپ ہر مخلوق میں پائی جاتی ہے۔ پرندے کھلے آسمان تلے، کھلی فضا میں آزادی سے اُڑتے ہیں، اُن کی خوشی اِسی میں ہے۔ پنجروں میں بند پرندے اپنی پرواز بھول جاتے ہیں۔ آبی جانوروں کی خوشی اور زندگی کا انحصار کھلے پانیوں میں رہنے پر ہے جہاں وہ آزادی سے رہتے اور چلتے پھرتے ہیں، ورنہ دم توڑ جاتے ہیں۔ یہی حال جنگلی حیات کا ہے، جنگل کے شیر اور چڑیا گھر کے شیر میں بڑا فرق ہے۔

بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی 'طوطے کا پیغام' جس میں پنجرے کی زندگی کو موت سے تعبیر کیا گیا۔ پرندہ آزاد ہونے کے لیے موت کا بہانہ کرتا ہے اور سبق دیتا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت، بڑی کوشش، بڑی حکمت کی ضرورت ہے۔

قوموں کی تاریخ میں آزادی کا عنوان بہت اہم ہے جو محتاج تعارف نہیں۔ اللہ نے انسان کو ذی شعور مخلوق بنایا اور اِسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور فیصلہ کرنے کا اختیار دے کر دُنیا میں بھیجا۔ تاکہ یہ آزادی سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اُن کا لوہا منوائے۔ گویا انسان کو فطرتاً اور طبعاً آزاد پیدا کیا گیا۔

انسان سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ سب کی اصل ایک ہے۔ انسان ہونے کے ناتے اُن میں کسی طرح کی درجہ بندی روا نہیں۔ اِس بات کی کوئی حقیقت نہیں کہ کوئی شخص برا اہما

Marfat.com

کے سر سے پیدا ہوا تو وہ معزز ہے اور کوئی پاؤں سے پیدا ہوا تو وہ اچھوت ہے۔ اِس بنا پر ذات پات کا بندھن سراسر خلافِ فطرت اور خلافِ انسانیت ہے۔

دینِ فطرت کی رُو سے ہر انسان کے حقوق ہیں۔ عزت و آبرو کے ساتھ جینے کا حق سب کا ہے۔ تعلیم اور ترقی حاصل کرنے کا حق سب کا ہے۔ سوچنے سمجھنے اور عقیدہ و مذہب کا حق اور اختیار سب کا ہے۔ اثر و رسوخ، شہرت اور دولت پر بھی سب کو حق حاصل ہے۔ لیکن یہ کسی کو حق حاصل نہیں کہ کوئی کسی کو غلامی کی زنجیریں پہنائے اور کسی سے اُس کا حق چھینے۔ یہ بات تو جانور کو بھی گوارا نہیں، چہ جائیکہ انسان کا معاملہ ہو۔ انسان کے ہاتھوں اِنسان کی غلامی انسانیت کی توہین اور تاریخِ انسانی کا بدترین المیہ ہے۔ طاقت اور جبر کے بل پر کمزور لوگوں کو غلام بنانے کی داستان بہت دِل خراش ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ دُنیا میں غلاموں کی منڈیاں بھی لگتی رہیں۔ غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی رہی۔ جس کا جو جی چاہے غلاموں کے ساتھ سلوک کرے، جب چاہے اُن سے کام لے۔ جب چاہا کسی دوسرے کے ہاتھوں فروخت کر دیا جیسے اشیاء اور اجناس کو خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ کسی کی پیٹھ داغ دی، کسی کی ٹانگ کاٹ دی، کسی کو اندھا اور کسی کو گونگا بنا دیا۔ تہذیب و اخلاق میں تو ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ غلامی ذلت ہے موت سے بدتر، جس سے انسانی صلاحیتیں اور اخلاقی قدریں زنگ آلود ہو جاتی ہیں، زندگی وبال بن جاتی ہے۔ قوموں کا تشخص، تمدن دم توڑ جاتا ہے۔ غلاموں کے پاس کچھ بھی ہو، اُن کا اپنا نہیں ہوتا۔ اُن کا سرمایہ اُن کے کام نہیں آتا۔ اُن کا کوئی حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

؎ غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے عزم و ہمت، اِستقامت اور اِتحاد کی ضرورت ہے۔ اب سے کم و بیش ساٹھ پینسٹھ برس پچھلی تاریخ پر نظر دوڑایئے، جب برصغیر کے مسلمانوں پر غلامی کا دور تھا۔ غلامی کی تقریباً ایک صدی جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوئی، انتہائی پُر آشوب دور!

غاصب اور استیصالی قوتوں نے جس طرح مسلمانوں کا جینا حرام کیا اور جس طرح اُن کے اُوپر انسانی حقوق کے دروازے بند کیے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

Marfat.com

یہ تو قدرت کا کرشمہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر احساسِ زیاں باقی رہا۔ آزادی چھن جانے اور کارواں لٹ جانے کا احساس! حصولِ آزادی کی تڑپ، اپنے آپ کو بیدار کرنے کا جذبہ کہ:

تیری زندگی اِسی سے تیری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

اللہ نے اُن کو غلامی کی دلدل اور روسیاہی کی ذلت سے بچانے کے لیے ان کے اندر بڑے بڑے بیدار مغز اور بصیرت کے حامل انسانوں کو پیدا کیا جنھوں نے علم و فن کی شمع جلا کر آزادی کی لَو کو تیز تر کیا، آزادی کی راہوں کو روشن کیا اور صبحِ آزادی طلوع ہوئی۔

□□□

Marfat.com

دِن منانے کارواج

مختلف موقعوں کی مناسبت سے بڑے جوش وخروش کے ساتھ دن منائے جاتے ہیں۔ عالمی یومِ خواندگی، صفائی کا دن، Anti Smoking Day، یومِ اساتذہ، بزرگوں کا دن، بچوں کا عالمی دن وغیرہ۔ دن منانا اچھی بات ہے، صحت مندانہ روایت ہے۔ اس سے ذمے داریوں کے بارے میں یاددہانی ہوجاتی ہے۔ کسی خاص مسئلے کے حوالے سے لوگوں میں شعور بیدار ہوتا ہے۔ یہ زندہ قوموں کی نشانی ہے کہ قومی تقاضے پیش نظر رہیں اور ہر شخص اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا صرف دن منالینا کافی ہے یا اِس کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں کہ مسائل کا یقینی حل اور مقاصد کا خاطر خواہ حصول ممکن ہو سکے۔ روایت بن چکی ہے کہ مخصوص حوالے سے دن منایا جاتا ہے، دھوم دھام کا مظاہرہ ہوتا ہے، جلسے اور جلوس منعقد ہوتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے بڑے بڑے عالمانہ و ماہرانہ اور پُرجوش خطاب سننے کو ملتے ہیں۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلند بانگ دعوؤں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر خوش کن احساس ہوتا ہے اور یقین ہونے لگتا ہے کہ ہمارے پاس بہت حساس دل و دماغ ہیں۔ ہم ملک وقوم کے لیے بہت اچھا سوچتے ہیں اور قوم نے اپنے قومی مقاصد حاصل کرنے کا عزمِ مصمم کیا ہوا ہے۔ ضمیر جاگ گیا ہے، روشن ہو گیا ہے اور بہت جلد ہم حقیقی معنوں میں باوقار اور زندہ اقوام کی صف میں شامل ہو رہے ہیں اور عنقریب ترقی وخوش حالی اور عزت ووقار کی صفِ اوّل میں ہوں گے۔

Marfat.com

اگلے دن خبر پڑھنے اور سننے کو ملتی ہے کہ قوم نے فلاں حوالے سے نہایت عقیدت و احترام اور جوش و جذبے سے دن منایا اور ہزاروں لوگوں نے شرکت کی وغیرہ۔ وقت گزرتا جاتا ہے یہاں تک کہ اگلے سال پھر دن منانے کا وقت آ جاتا ہے اور قوم ایک مرتبہ پھر نئے جوش، نئے ولولے کے ساتھ دن منا کر اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ تو جاری رہتا ہے مگر مقصدیت کے حوالے سے ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔

ہفتۂ صفائی منانے کا اعلان ہوا۔ بڑے اہتمام سے تشہیری مہم چلتی ہے۔ بڑے بڑے بینرز آویزاں ہوتے ہیں جن پر بہت خوش نما، اچھے اور سچے سلوگن تحریر ہوتے ہیں۔ مثلاً ''صفائی نصف ایمان ہے''، ''صفائی قوموں کے اچھے ذوق اور اعلیٰ تمدن کی آئینہ دار ہے''، ''صفائی کا خاص خیال رکھیں''، ''ماحول کو آلودگی سے بچائیں'' وغیرہ وغیرہ۔ جلسے ہوئے، صفائی کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے واک کا اہتمام بھی ہوا۔ جلسوں سے بہت سے محبِ وطن لوگوں نے خطاب کیا ''ہم ملک کے کونے کونے کو گلزار بنا دیں گے''، ''ہم اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھیں گے''، ''گھروں کی طرح اپنے گلیاں بازار بھی چمکا دیں گے'' یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ ملک کو صاف ستھرا اور خوبصورت بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔ اس کے بغیر ہم ایک شائستہ اور مہذب قوم نہیں بن سکتے!

جلسہ برخاست ہو گیا۔ ہفتہ صفائی گزر گیا۔ زندگی جوں کی توں جاری رہی۔ گندے پانی کا نکاس درست نہ ہو پایا۔ جابجا گندگی کے ڈھیر نظر آتے رہے۔ گاڑیوں کے دھوئیں اور شور سے فضا بدستور آلودہ رہی اور ہفتۂ صفائی کا مقصد ایک ہفتے کے لیے بھی پورا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اگلے سال پھر یومِ صفائی آ گیا۔ سوچنے کی بات ہے! آخر کوئی بھی دن منانے پر اخراجات تو اُٹھتے ہیں! کچھ تو مثبت پیش رفت ہونی چاہیے۔ احساس تو ہمیشہ بیدار رہنا چاہیے۔

ہر سال بزرگوں کا دن بھی منایا جاتا ہے مگر بزرگوں کا حقیقی احترام ہمارا مستقل شعار نہیں بنا۔ یومِ خواندگی منایا جاتا ہے مگر تعلیم و تربیت میں توازن نہیں آ سکا۔ ہر سال یومِ اقبال منایا جاتا ہے مگر پیغامِ اقبال کو سمجھنے کی توفیق میسر نہ آئی۔

□□□

Marfat.com

گداگری کا روگ

ایک گداگر سے کسی نے پوچھا کہ تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اچھے خاصے صحت مند ہو، ٹھیک ٹھاک ہو، کوئی کام کیوں نہیں کر لیتے؟ دربدر بھی ہوتے ہو، دوسروں کے آگے ہاتھ بھی پھیلاتے ہو۔ کوئی تم پر ترس کھاتا ہے، کوئی دھتکار دیتا ہے۔ کچھ تو اپنی عزتِ نفس کا خیال کرو۔ محنت کر کے روزی کماؤ اور عزت سے زندگی گزارو۔

بھکاری بولا کہ محنت ہی تو کرتا ہوں۔ سردی ہو یا گرمی، دھوپ ہو یا چھاؤں، صبح سے شام تک سارا سارا دن بھیک مانگنے کے لیے مشقت اُٹھاتا ہوں۔ اب اور کیا محنت کروں! جاؤ بابا جاؤ! اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔

بھئی آپ تو ناراض ہو گئے! میرا مطلب ہے کہ بڑے اچھے اچھے اور معزز پیشے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ! تندرست اور صحت مند ہیں۔ اپنا راستہ بدل لیں اور یہی محنت دوسری طرف کریں تا کہ آپ کی کمائی میں بھی برکت ہو اور گلیوں کی خاک چھاننے سے بھی نجات مل جائے۔ عزتِ نفس محفوظ رہے۔

اُس نے کہا آپ کس دُنیا میں رہتے ہیں، کیسی باتیں کرتے ہیں، میں نے یہ کام خوب سیکھ لیا ہے، اِس میں اپنے آپ کو کھپا لیا ہے۔ اب میں کسی اور طرف جانے کا نہیں۔ رہی بات معزز پیشوں کی تو نجانے وہ کن کے لیے ہیں؟ اُس کے لب و لہجے میں دُکھ کا احساس تھا، محرومی کا شکوہ۔

Marfat.com

کہنے لگا، ضرورت سے مجبور ہو کر انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ بیروزگاری سے تنگ آ کر اور ہر طرف سے مجبور ہو کر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اس راہ چلنا پڑا۔ اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

اسی طرح کسی نے ایک بچے سے پوچھا تھا جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پہ بیٹھا کچرا سمیٹ رہا تھا، کہ بیٹا! تم یہ کام کیوں کر رہے ہو، گندگی میں کیوں بیٹھے؟ تو اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس کا رونا بہت معنی خیز تھا!

گلیوں اور بازاروں کے علاوہ اب تو مساجد اور دفاتر میں بھی بھکاری نظر آتے ہیں۔ اُن میں چھوٹے بڑے، مرد عورتیں، معذور اور تندرست ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کی اکثریت تو یقیناً پیشہ ور گداگروں کی ہے اور اُن کا صاف پتہ بھی چل جاتا ہے، مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو واقعی حالات کے ستائے ہوئے، غربت و افلاس زدہ ہوتے ہیں اور مجبور ہو کر دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔

لمحۂ فکریہ ہے کہ ملک و ملت کے وسیع تر مفاد میں اس مسئلے کی سنگینی کو محسوس کیا جائے۔ افراد کی صلاحیتوں کو زنگ لگنے سے بچایا جائے۔ اِس صورتِ حال کا پیغام خاص طور پر اُن لوگوں کے نام ہے جو معاشی لحاظ سے مضبوط ہیں، جن کے پاس دولت کے انبار ہیں کہ وہ غربت و افلاس زدہ، محروم المعیشت اور بیروزگار طبقے کو باعزت طور پر معاشی دھارے میں شامل کریں۔ انسان تو سارے انسان ہیں۔ وسائل کی کمی بیشی کے حوالے سے تفاوت ضرور ہے مگر عزتِ نفس تو سب کی برابر ہے۔

انسانیت کا تقاضا ہے کہ کوئی کسی کے ہاتھوں پریشان نہ ہو۔ دولت کے لالچ میں دوسروں پر معاش کے دروازے بند نہ کیے جائیں۔ کوئی اِس حال کو نہ پہنچے کہ گداگری پر اُتر آئے اور معاشرے پر بوجھ بن جائے۔ ضروری ہے کہ اپنی مدد آپ کے تحت بھی لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

جو لوگ درد مند دل رکھتے ہیں اور معاشرتی فلاح و بہبود کے منصوبے بناتے ہیں اور کوئی بڑا کام کرنا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ یہ مسئلہ بھی اپنی ترجیحات میں شامل کر لیں۔ ہمارا ماضی تو ایسے واقعات سے بھی روشن ہے کہ جانوروں تک کی بھوک پیاس کو بھی محسوس کیا گیا اور اس معاملے میں خود کو ذمے دار اور قابلِ مواخذہ سمجھا گیا۔ صاحبِ اختیار اور صاحبِ ثروت طبقوں کے ہوتے ہوئے اگر کوئی بھوک سے مرتا ہے یا بھیک مانگنے پر مجبور ہوتا ہے تو یہ مقامِ افسوس ہے۔

Marfat.com

معجزے کے انتظار میں کہیں دیر نہ ہو جائے!

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی بزرگ کی دینداری اور پارسائی کا شہرہ سن کر ایک شخص بہت دُور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ دن ان کے پاس رہا۔ اس دوران نہ تو اس نے کچھ پوچھا نہ اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ آخر ایک دن خاموشی سے واپس جانے لگا تو اُن بزرگ نے اس سے پوچھا کہ بھئی کیسے آنا ہوا تھا؟ تم نے کچھ بتایا ہی نہیں اور اب اُسی طرح واپس جا رہے ہو! کہنے لگا کہ حضرت! میں نے تو آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، مگر جیسا سنا تھا ویسا پایا نہیں۔ اپنے اس قیام کے دوران میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی، کسی عجیب بات کا مشاہدہ نہیں کیا۔ میرے آنے کا تو یہی مقصد تھا جو پورا نہیں ہوا لہٰذا واپس جا رہا ہوں۔ شکوہ بڑا تلخ تھا۔ ایک چیلنج والی بات تھی۔ شاید کوئی دیکھنے سننے والا یہ سمجھتا کہ اس پر شدید ردِّ عمل ہو گا۔ بزرگ ناراض ہوں گے اور اُس کو بُرا بھلا کہتے ہوئے دُھتکار دیں گے۔ مگر اللہ کے سچے بندوں کی شان ہی اور ہوتی ہے۔ ان کی باتوں میں حکمت اور کردار میں حقیقت کارفرما ہوتی ہے۔

اجنبی کی بات پر ذرا ناراض نہ ہوئے بلکہ سمجھانے کے انداز میں فرمانے لگے کہ کیا تم نے مجھ میں کوئی ایسی بات بھی دیکھی جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہو؟ اُس نے کہا نہیں، مجھے ایسی تو کوئی بات نہیں ملی۔ کہنے لگے کہ بس! میری کرامت یہی ہے کہ میرا کوئی قول و فعل سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ ہو۔

Marfat.com

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کو کسی کے بزرگ اور برگزیدہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اُس سے خارقِ عادت باتوں اور کرشموں کا ظہور ہو۔ وہ اُن کو ہواؤں میں اُڑ کر دکھائے یا ڈوبی ہوئی کشتیاں تیرا دے۔ ایسی باتیں تو شعبدہ بازی کے تحت بھی منظر عام پر آ جاتی ہیں۔ مگر کسی کی عظمت اور پارسائی کی دلیل قرار نہیں پاتیں۔ اللہ کے دین میں اِنسانی عظمت و بزرگی کا معیار یہ ہے کہ کوئی تقویٰ سے آراستہ ہے یا نہیں۔ وہ اطاعتِ رسول ﷺ میں زندگی گزارتا ہے یا نہیں! چنانچہ زبان رسالت مآب ﷺ سے اعلان کروایا گیا کہ جو اللہ کا قرب چاہتا ہے اور اس سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے، اُسے چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے۔

خارقِ عادت باتیں اور معجزات انبیائے کرامؑ کے ساتھ خاص تھے، بہت سے معجزات ظہور میں آتے رہے۔ مثلاً یدِ بیضا، عصائے موسوی، تختِ سلیمانی، دمِ عیسیٰ اور شق القمر وغیرہ۔ بہت سے معجزات ہیں جن کی تفصیلی وضاحت یہاں درکار نہیں، مگر محض معجزات دکھانا کسی نبیؑ کا اصل مقصدِ بعثت نہیں تھا۔ اللہ کی مشیت کے تحت خاص خاص مواقع پر ایسا ہوا۔ چنانچہ نبی آخر الزماں ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا "یتلُوا علیهم آیاته ویزکیهم وَيُعَلِّمُهُم الکتب والحکمة" یعنی وہ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں، اُن کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں اور اُنھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ انبیائے کرام ﷺ کا مقام و مرتبہ دُنیا کے اگلے پچھلے سب لوگوں سے ممتاز اور اعلیٰ و ارفع ہے اور مقامِ نبوت و رسالت کا نقطۂ عروج بعثتِ محمدی ﷺ ہے۔

مخالفین نبوت کہا کرتے تھے کہ جس قیامت کی روز روز بات کی جاتی ہے اور ڈرایا جاتا ہے، وہ آ کیوں نہیں جاتی! مطالبہ کرتے تھے کہ فرشتے ان کے سامنے آئیں۔ کہتے تھے کہ قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں ہوتا اور اس طرح کی بہت سی باتیں۔ لیکن چونکہ بعثت کا اصل مقصد یہ نہیں تھا لہٰذا لوگوں کو سمجھایا گیا کہ تم اپنے کردار کی اصلاح پر توجہ دو۔ اللہ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں، وہ ازخود یا اپنے برگزیدہ بندوں کے دُعا کرنے پر کچھ غیر معمولی انداز میں برپا کرنے پر قادر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی مثال دے کر سمجھایا گیا کہ اُس کا حال جانو، کہ بنی اسرائیل کا ہر مطالبہ پورا کر دیا گیا مگر وہ ان کے حق میں بہتر ثابت نہ ہوا بلکہ وبالِ جان بن گیا۔

Marfat.com

اِحسانِ عظیم کی ناقدری کا نتیجہ

آج معاشرے میں اس قدر گھٹن اور بدامنی ہے کہ بیان سے باہر! معاشرتی زندگی کے لیے جس اعتماد، رواداری اور صبر و برداشت کی ضرورت ہے، وہ مفقود ہے۔ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنا اور بدگمانی میں رہنا لوگوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ خودغرضی اس قدر ہے کہ بس اپنا ہی آپ سامنے ہے، کسی کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔ مفاد پرستی کے شدید دباؤ نے جائز و ناجائز کی تمیز مٹا دی۔ آتشِ انتقام نے خون سفید کر دیے گویا:

ع ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو

ابتری کی اس صورتِ حال پر انسانیت اشک بار ہے۔ خرابی دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ صد افسوس کہ اُسوۂ حسنہ کی حامل ذاتِ اقدس کی ہمہ جہت سیرت کے ہوتے ہوئے ہمارا یہ حال ہے۔ نعمت تو کوئی بھی ہو شکر کی متقاضی ہے جب کہ سیرتِ محمدی ﷺ تو نعمتِ عظمیٰ ہے۔ نعمتِ عظمیٰ یا احسانِ عظیم جس قدر شکر اور احسان مندی کا تقاضا کرتا ہے اُس کا کما حقہٗ بیان ممکن نہیں۔ اس نعمت کا سراسر تقاضا من و عن اطاعت و فرماں برداری ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس تقاضائے نعمت سے انحراف ہوا۔ اسی نعمت کی ناقدری کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان دست و گریباں ہو گئے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے، عدم رواداری اور عدم برداشت نے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ معاشرہ خوف و ہراس کی لپیٹ میں آ گیا، عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ حقیقت میں یہ منطقی انجام ہے

Marfat.com

احسانِ عظیم کی ناقدری کا اور یہ عین تقاضائے فطرت ہے کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ''وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ'' کہ اگر تم شکر ادا کرتے رہو گے تو میں تمہیں اور نوازوں گا لیکن اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔ معاشرے کی موجودہ اجتماعی ابتر صورتِ حال میں بنیادی ضرورت ہمہ گیر سیرتِ نبوی ﷺ کے اُس پہلو سے بھی سبق سیکھنے کی ہے جو مثالی رواداری اور صبر و برداشت سے عبارت ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ مکہ محمد ﷺ کو سب سے زیادہ معتبر اور صادق و امین سمجھتے تھے۔ ۴۰ سال سے آپ کو بخوبی جانتے تھے۔ آپ کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ اُن کے درمیان گزرا تھا۔ آپ کی زندگی کا ہر ہر پہلو ان لوگوں پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا جس پر اُنگلی اُٹھانے کی کسی کو جرأت نہ ہو سکی۔ مگر جیسے ہی اللہ کے نبی ﷺ نے اُن کو دعوتِ حق دی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے، دُشمنی پر اُتر آئے اور دُشمنی میں بدحواس ہو گئے۔ ایک بہت ہی قریبی رشتے دار نے بددعا دی کہ تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں یعنی تو ہلاک ہو۔ کیا یہی کہنے کے لیے ہمیں بلایا تھا؟ بہت سخت اور اذیت ناک بات تھی مگر رسولِ رحمت ﷺ نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ قلبِ اطہر پر کیا گزری ہو گی! مگر صبر کیا۔

دُنیا کے اِس سب سے بڑے اور سچے انسان کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے، راہ چلتے ہوئے ذاتِ اقدس پر کوڑا کرکٹ پھینکا گیا۔ حرمِ کعبہ میں نماز کے دوران جسمِ اطہر پر گندگی کا ڈھیر رکھ دیا گیا۔ حالتِ نماز میں رسالت مآب ﷺ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر کھینچا گیا۔ یہ ہتھکنڈے کس قدر گھٹیا، مذموم اور کرب ناک تھے! کتنی تکلیف ہوتی ہو گی! کیسے بیاں ہو، مگر زبانِ اقدس سے نہ کبھی بددُعا نکلی اور نہ کبھی کسی سے انتقام لیا۔ خاندان کے بچوں بوڑھوں سمیت گھاٹی میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی بند کر دی گئی۔ تین سال تک یوں بھی پیمانۂ صبر کو آزمایا گیا مگر اس دوران میں بھی حرفِ شکایت زبان مبارک پر نہ آیا، انتقام لینا تو درکنار! طائف والوں نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی کہ اللہ کے نبی ﷺ کو پتھروں سے لہولہان کیا۔ اس حال میں اپنی بے بسی کا اظہار صرف اللہ کے حضور کیا اور پتھر مارنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ اصحابِ کرامؓ کے ساتھ بھی کفار کا یہی رویہ تھا۔ اُن میں سے جب بھی کسی نے کافروں کے ظلم و تشدد سے تنگ آ کر بددعا کی درخواست کی تو آپ نے ہر دفعہ صبر و برداشت کی تلقین فرمائی۔ دُشمنوں نے

Marfat.com

قتل کا منصوبہ بنایا۔ آپ چاہتے تو اپنے ساتھیوں کو جوابی کارروائی کے لیے تیار کر لیتے، آخر ایک باقاعدہ جماعت ایمان لا چکی ہوئی تھی، مگر آپ ﷺ نے ہجرت کو ترجیح دی اور دل پر پتھر رکھ کر اپنے آبائی شہر کو الوداع کہا۔ اس ضرب المثل رواداری اور صبر و برداشت کا اثر چشمِ فلک نے دیکھا کہ دُشمن کا ہر حربہ بالآخر ناکام ہوا اور پیغامِ سیرت نے دلوں کی کایا پلٹ دی۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اُس پیغام کو یاد کیے بغیر معاشرہ امن اور اعتماد کی دولت سے بہرہ ور ہو سکے!

□□□

نعمت تو کوئی بھی ہو شکر کی متقاضی ہے بلکہ

سیرتِ محمدی ﷺ تو نعمتِ عظمیٰ ہے۔

Marfat.com

درسِ عبرت

فرعون جب دریا کی تند و تیز طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر تھا اور ڈوب جانے کے قریب ہوا تو اس کا سارا کرّوفر اور کبر و غرور خاک میں مِل چکا تھا۔ اپنے آپ کو رب کہنے اور کہلوانے والا، لوگوں سے اپنی پوجا کروانے والا، آج انتہائی بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ عالمِ حسرت و یاس میں جب اُسے کچھ نہ سوجھا تو اُس نے سوچا کہ کیوں نہ اُس حقیقت کا اعتراف کرلیا جائے جس کو تسلیم کرنے کی دعوت اُسے موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ چنانچہ منہ زور موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے کہنے لگا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لاتا ہوں "اٰمَنْتُ بِرَبِّ موسٰی و ھارون" مگر:

ع ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت! اب تو وقت گزر چکا تھا۔ مہلت ختم ہو چکی تھی۔ کاش یہ خیال اسے پہلے آجاتا! کہتے ہیں کہ:

؎ دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

چنانچہ اُس سرکش اور ظالم و جابر بادشاہ کی بے بسی کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔ اللہ کی قدرت و طاقت کے آگے اُس کی ایک نہ چلی، اُس پر توبہ اور معافی کا دروازہ بند ہو گیا۔ فرعون غرق

Marfat.com

ہوا اور اُس کی ذلت آمیز موت ایسا نشانِ عبرت بنی جو اپنی نوعیت میں بے مثال ہے۔ اُسے خبردار کیا گیا تھا کہ تجھے داستانِ عبرت بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے، دُنیا جانتی ہے کہ مصر کے عجائب گھر میں اب بھی فرعون کی لاش موجود ہے جو درسِ عبرت فراہم کر رہی ہے۔ قرآنِ حکیم میں جا بجا اس قسم کے واقعات کا تذکرہ ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان حالات و واقعات کی روشنی میں اپنے کردار پر نظرِ ثانی کریں اور حد سے تجاوز کرنے سے بچیں تا کہ کسی خوفناک انجام سے محفوظ رہ سکیں۔ قرآن کہتا ہے: ''وتلك الامثال نضربها لِلنّاس لَعلّهم يتفكرون'' یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔

فرعون اور آلِ فرعون کی طرح قرآن نے اصحابِ فیل کا واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ خواہش نفس کے پجاریوں کو اللہ ذوالجلال والاکرام نے اُن کے غرور کا ایسا مزہ چکھایا کہ صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔ چڑیوں کو ہاتھیوں کے لشکر کی موت اور تباہی کا سامان بنا دینا اللہ ہی کی قدرت کا عظیم کرشمہ ہے۔ کاش کہ انسان سوچے، سمجھے اور غور کرے۔

قرآن قومِ نوح کا ذِکر کرتا ہے اور اُس کے انجامِ بد کی خبر دیتا ہے۔ رُوئے زمین کا پانیوں کی لپیٹ میں آ جانا اور سیلاب کا پہاڑ کی چوٹی تک نافرمان لوگوں کا پیچھا کرنا اور پھر اُن کا غرقِ آب ہو جانا۔ کیا اس میں سامانِ عبرت نہیں کہ اس کے پیچھے کس کا دستِ قدرت کارفرما تھا؟

ع ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

قوم عاد و ثمود وغیرہ کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ نافرمانیوں کی پاداش میں وہ کس طرح کیفرِ کردار کو پہنچیں، الہامی تعلیمات میں تفصیلی وضاحت موجود ہے۔ اُن کی تباہ شدہ بستیاں اُن پر گزرنے والے عذاب کا پتہ دیتی ہیں۔ اُن کے کھنڈرات اُن کی بے بسی کی بھیانک تصویریں ہیں جن میں آنے والی نسلوں کے لیے دعوتِ فکر ہے کہ لوگو! حقیقت سے انحراف اور حد سے تجاوز کر کے اللہ کے غضب اور عذاب کو دعوت نہ دو۔ ایسا کون ہے جو اُس کے عذاب کا متحمل ہو سکے اور ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے آگے ٹھہر سکے! دعوتِ فکر ہے کہ دینِ فطرت کو سمجھو، انبیائے کرام کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کو قبول کر لو جو حقیقی روشنی ہے۔

□□□

Marfat.com

حُرمتِ کعبہ

خانہ کعبہ کا طواف زمانۂ جاہلیت میں بھی کیا جاتا تھا مگر اُس کا انداز بہت مختلف اور غیر فطری تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ انسان جو بہت خطا کار اور گنہگار ہے، اس کے جسم کا لباس بھی گناہوں سے آلودہ اور ناپاک ہے، جسے پہن کر اللہ کے گھر میں داخل ہونا اور اس کا طواف کرنا باعثِ توہین ہے۔ لہٰذا وہ فرطِ عقیدت میں تمام اخلاقی حدود پار کر جاتے اور یوں خواہشِ نفس کی پیروی میں بظاہر بے ادبی سے بچنے کے لیے وہ ایسی حرکت کا ارتکاب کر جاتے جس سے پورا نظامِ اخلاق شرما جائے اور حیاداری کے تمام تر تقاضے مجروح ہو جائیں، یعنی بے لباس ہو کر کعبہ کا طواف کرتے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ سب کچھ روا تھا۔

دینِ فطرت نے فکرِ انسانی کے تمام دھارے بدل دیے۔ زندگی گزارنے کے لیے جامع اور قابلِ عمل پروگرام دیا۔ عبادت و بندگی کا پاکیزہ نظام دیا اور عفت و حیاداری کو جزوِ ایمان بنا کر اخلاقیات کا جوہر اور انسانیت کا زیور قرار دیا۔

بات یہ ہے کہ لباس کسی کی شخصیت کا آئینہ دار تو ہے، لیکن اس سے بھی پہلے یہ انسان کی ضرورت اور فطری پہچان ہے۔ لیکن جب کوئی فطرت سے بغاوت پر آمادہ ہو جائے، وہ کیونکر اس ضرورت کو محسوس کرے گا! فطرت سے انحراف کا رجحان تو یقیناً زوال پر منتج ہوتا ہے۔ دورِ جاہلیت کا معاشرہ بنیادی طور پر اسی رجحان کا شکار تھا اور لوگ دُنیا کے مقدس ترین مقام خانۂ کعبہ کے اندر

Marfat.com

بھی اخلاقی قدروں کو نہ صرف پامال کرتے تھے بلکہ اُسے عقیدت اور عبادت سمجھتے تھے۔

اسلام کی روشنی کفر و جہالت کے اندھیروں کو چیرتی ہوئی نمودار ہوئی تو بیت اللہ کا تقدس بحال ہو گیا۔ اس کی عظمتِ رفتہ لوٹ آئی۔ حضور رحمتِ عالم محمد رسول اللہ ﷺ نے افراد کا تزکیۂ نفس کیا، معاشرے کو ٹھوس بنیادیں فراہم کیں، لوگوں کے اخلاق کی اِصلاح کی اور جاہلی رسوم کا خاتمہ کیا۔ اعلانِ عام فرمادیا کہ آئندہ کوئی شخص برہنہ حالت میں خانۂ کعبہ میں داخل نہیں ہوگا۔ شرافت، غیرت اور عقیدت کو ضابطے کا پابند کر کے اخلاقی حدود قائم کر دی گئیں۔

مکہ فتح ہوا تو بیت اللہ کی طہارت و پاکیزگی کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ سب سے پہلے اللہ کے گھر کو بتوں کی آلودگی سے پاک اور کفر و شرک کی تمام تر علامتوں سے صاف کیا گیا۔ مناسکِ حج میں اصلاح کی گئی اور تعظیمِ کعبہ کے باوقار طریقے بتائے گئے۔ اب ''احرام'' عازمینِ حج کا لازمی لباس ہے جو مسلم اُمہ کے عالمگیر اتحاد و یگانگت کا مظہر بھی ہے اور مساواتِ انسانی کی علامت بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہر طرح سے وحدہ لاشریک ہے۔ اُسی کا نام قدوس بھی ہے اور سبحان بھی۔ اُسے یہ گوارا نہیں کہ اُس کے ساتھ کوئی ذرا سا بھی شریک ہو اور اُس کے گھر کو کسی بھی طرح کی ضعیف الاعتقادی اور بدعملی کی گندگی سے آلودہ کیا جائے۔

خانہ کعبہ دُنیا میں تعمیر ہونے والی سب سے پہلی عبادت گاہ ہے، جسے توحیدِ خالص کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا، یعنی اس لیے کہ یہاں صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی حمد و ثنا اور عبادت و بندگی ہو۔ انبیائے کرامؑ نے اللہ کے حکم سے دُور و نزدیک کے رہنے والوں کو اس گھر کی طرف بلایا۔ اللہ نے اپنے گھر کی عزت و عظمت خود بیان کی۔ اس گھر کی بدولت مکہ بَلَدِ امین اور حرم کہلایا۔ اِسی کی بدولت شہر مکہ رسول اللہ ﷺ کو بے حد عزیز رہا۔

احترامِ کعبہ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے تقاضائے ایمان کے تحت بیت اللہ کو دل و جان سے اپنا مرکز تسلیم کریں۔ باہمی اختلافات سے بالاتر ہو کر اُمتِ واحدہ بن جائیں، مرکز سے وابستہ رہیں، بیت اللہ عالمِ اسلام کی مرکزیت کا مظہر تو ہے ہی، پوری نسلِ انسانی کے لیے بھی اس میں لمحۂ فکریہ ہے۔ ایک پیغام ہے کہ نسلِ انسانی کی اصل ایک ہے۔ اللہ کا دین ایک ہے جس کا خطاب ہر دور کے انسان سے ہے۔

□□□

Marfat.com

سچائی کی طاقت

اصل قوت وطاقت سچائی کی ہے۔سچائی بالآخر اپنا آپ منوالیتی ہے۔جب حق وصداقت کا دور دورہ ہوتا ہے تو باطل دُم دبا کر بھاگتا ہے، اُسے چھپنے کو جگہ نہیں ملتی، بے نقاب ہو جاتا ہے، ٹھکرا دیا جاتا ہے اور خاک میں مِل جاتا ہے۔سچائی کے علمبردار ہمیشہ سرخرو ہوتے ہیں، بس اس کے لیے استقامت شرط ہے۔

مخالفین نے حق کی آواز دبانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔زبان درازی اور دست اندازی کے بعد بڑے سے بڑا لالچ دیا، حق و باطل میں سمجھوتہ کرنے کے لیے پے در پے وفود بھیجے۔پھر انتقامی کارروائیوں پر اُتر آئے، ہر حربہ آزمالیا۔مطالبہ یہ تھا کہ معبودانِ باطل اور ان کے پجاریوں کو ہدفِ تنقید نہ بنایا جائے۔یہ ان کے آباؤ اجداد کے مذہب اور رسم و رواج کے خلاف ہے جو اُنھیں کسی قیمت پر گوارا نہیں۔

مگر پیکرِ حق وصداقت کا عزم یہ تھا کہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے سے باز نہیں آنا خواہ اُس کے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔یہاں تک کہ باطل دم توڑ دے اور کلمۂ حق غالب آجائے۔جان جائے تو جائے، سچ کو کوئی آنچ نہ آئے۔کچھ بھی ہو جائے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں۔

''لکُم دینکُم ولِیَ دِین'' فرما کر ہمیشہ کے لیے اہلِ حق اور اہلِ کفر کے راستے

Marfat.com

الگ کر دیے۔ سچائی کے دُشمن سر ٹکراتے رہے، ٹکرا ٹکرا کے پاش پاش ہو گئے، داستانِ عبرت بن گئے، جو رہا تو کلمۂ حق رہا۔

پھر جو بھی اس کلمۂ حق کے ساتھ وابستہ ہوا، دامنِ رحمت میں آ گیا، محفوظ ہو گیا، بقائے دوام پا گیا اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو گیا۔ سچائی کا علمبردار بن کر جس نے بھی جدوجہد کی وہ دوسروں کے لیے روشنی کی علامت بن گیا۔

قیامِ پاکستان تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ نظریاتی مملکت ہے اور جو نظریہ اس کے قیام کا محرک بنا وہ کلمۂ حق یعنی نظریۂ اسلام تھا۔ چونکہ ابدی صداقت کی بنیاد پر قائم ہونے والے ملک کا وجود باطل کو گوارا نہیں لہٰذا مخالفین نے تحریکِ پاکستان کو ناکام بنانے کے لیے ہر چال چلی۔ مسلمانوں نے اس تحریک کی آبیاری کے لیے عدیم المثال قربانیاں پیش کیں۔ دُشمنوں نے مسلمانوں کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لیے دیوانے کا خواب قرار دیا۔ الگ وطن کے حق میں قرارداد پاس کی گئی تو اُس کا مذاق اُڑایا گیا۔ وطنِ عزیز معرضِ وجود میں آ گیا تو اس کے بارے میں بدظنی پھیلائی گئی اور کہا گیا کہ یہ تو چند دن کا مہمان ہے۔

اصل میں یہ مخالفت برائے مخالفت کرنے والوں کی بدحواسی تھی۔ باطل نے حق کا راستہ روکنے کے لیے ہمیشہ یہی کچھ تو کیا ہے۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ پاکستان بن کے رہا، قائم رہا اور اِن شاءاللہ! پوری عظمتِ شان کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گا۔ اس کا دُشمن ناکام ہوا اور ہمیشہ ناکام رہے گا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے اور اصولوں پر کاربند رہنے والے، سچائی کا نعرہ بلند کرنے والے، جہدِ مسلسل اور جذبۂ ایمان سے سرشار لوگ بالآخر منزل کو پا لیتے ہیں۔

سچائی وہ روشنی ہے جس سے نفرتوں، عداوتوں، ہٹ دھرمیوں اور بغض و حسد کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ انسان میں وسیع الظرفی اور وسعتِ نظری پیدا ہوتی ہے، رواداری آتی ہے۔ وہ صرف اپنا حق وصول کرتا ہے، دوسروں کو اُن کے حقوق سے محروم نہیں کرتا۔

ضروری ہے کہ سچائی کی روشنی سے قلب و نظر کو منور کر لیا جائے، سچ کو تلاش کیا جائے، سچائی کو تسلیم کیا جائے، سچ بولا جائے اور سچ بولنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، اسی میں عزت ہے۔

□□□

Marfat.com

وقت کسی کا منتظر نہیں!

کہا جاتا ہے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ یہ بات صرف کہنے کی حد تک نہیں، گزرتے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ اس کی صداقت کی شہادت ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ فطرت کے قوانین ہمیشہ طے شدہ اور اٹل ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کا ایک وقت ہے۔ اُس نے جو بھی کرنا ہے اُسی دورانیے میں کرنا ہے۔ اگر کوئی وقت کے ساتھ نہیں چلتا تو بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

واضح سی بات ہے کہ اگر ہم روز کا کام باقاعدگی کے ساتھ روزانہ ہی کرتے رہیں تو ہمیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ لیکن اگر تن آسانی کا مظاہرہ کریں اور یہ سوچ لیں کہ چلو آج کا کام کل کر لیں گے تو وہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہی رویہ اپنائے رکھیں تو اُس کام کی انجام دہی مشکل تر بلکہ ناممکن صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کسی کام کے لیے جو وقت مقرر تھا گزر گیا، جواب واپس نہیں آ سکتا۔ اگر کوئی وقت کو واپس لا سکتا ہوتا تو یقیناً پریشان نہ ہوتا اور کسی بھی کام کو کسی بھی وقت انجام دے لیتا۔ لیکن کام کا انجام نہ پانا اور اُس پر انسان کا پچھتانا دلیل ہے اس بات کی کہ گزرا ہوا وقت واپس نہیں لایا جا سکتا۔ روزمرہ گفتگو میں ''کاش'' کا لفظ بھی اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے۔ کاش ایسا ہوتا! کاش ایسا نہ ہوتا! وغیرہ۔

اساتذہ کرام، عزیز طلبہ کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ اُنھیں یہ نصیحت بھی کرتے رہتے ہیں کہ بچو! آج کا کام کل پر مت ڈالو، باقاعدگی سے کام کیا کرو، جو پڑھایا سکھایا جاتا ہے اس کی تیاری ساتھ

Marfat.com

ساتھ کرتے رہو تا کہ امتحان کے دنوں میں کوئی پریشانی لاحق نہ ہو اور مناسب کامیابی حاصل کر سکو۔

مگر اکثر طلبہ اس خیر خواہانہ نصیحت کو بالکل بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ بہت سے تو کتابوں کے بغیر ہی ہوتے ہیں۔ اگر کسی سوال کا جواب پوچھ لیا جائے تو آئیں بائیں شائیں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُن کی زیادہ تر دلچسپی ایسی سرگرمیوں میں دکھائی دیتی ہے جو اصل میں علم و ادب کے طالبوں کے شایانِ شان نہیں۔ سارا سال اسی طرح گزار دیتے ہیں۔ پھر جب امتحان سر پہ آ جاتا ہے تو گویا مبتلائے مصیبت ہو جاتے ہیں اور 'Short cuts' تلاش کرتے ہیں۔ کوئی guess کے پیچھے بھاگتا ہے، کوئی کچھ کرتا ہے کوئی کچھ۔ کاش وہ اساتذہ کی نصیحت پر کان دھرتے تو آج پریشان نہ ہوتے۔

وقت کی قدر کا احساس اور پابندیٔ وقت اسی لیے ضروری ہے کہ گزرا ہوا وقت انسان کی پہنچ سے باہر اور آنے والا انتہائی غیر یقینی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنا کام آج نہیں تو کل کر لے گا، تو پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ اُس کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ وہ کل تک ہوگا بھی، یا کل کو اُسے وقت میسر ہوگا؟ آنے والا وقت تو غیر یقینی ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے، کوئی بیماری، معذوری، کوئی ناگہانی صورتِ حال! آنے والا وقت جس کے انتظار میں انسان اپنے آج کو داؤ پر لگاتا ہے اور بروقت کام نہیں کرتا، آخری وقت بھی تو ثابت ہو سکتا ہے! ایسے بہت سے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔

انسان کی کمزوری ہے کہ مستقبل کے لیے بہت 'Planning' کرتا ہے مگر حال کو بھول جاتا ہے۔ اِس کی قدر نہیں کرتا حالانکہ اس کا اصل وقت اس کا ''حال'' ہے جس میں اسے بننا یا بگڑنا ہے۔ ماضی کے جھروکوں میں نظر دوڑائیں تو جتنی بھی مشہور و معروف اور قد آور شخصیات دکھائی دیتی ہیں، جنھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے، اُن سب کی زندگیوں میں پابندیٔ وقت بنیادی اہمیت کا حامل عنصر رہا ہے۔ جنھوں نے وقت کا ساتھ دیا اور ہر کام وقتِ مقررہ پر انجام دیا۔ وقت نے اُن کی عظمت ثابت کر دی، تاریخ نے اُن کے کارناموں کو بطور مثال محفوظ کر لیا۔

یہ وقت اور زمانے کی اہمیت ہی تو ہے کہ خالقِ کائنات نے زمانے کی قسم اُٹھا کر انسان کو خبردار کیا ہے کہ اگر وہ اپنے وقت مقررہ کے اندر اندر اپنے زاویۂ فکر کو درست نہیں کرتا اور معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا نہیں کرتا تو اُسے یقین کر لینا چاہیے کہ اُس کا خاتمہ بالخیر نہیں ہو سکتا اور وہ ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونے والا ہے۔

Marfat.com

کتاب دوستی

ہمارے ایک جاننے والے تھے، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُنھیں جنون کی حد تک کتابوں سے لگاؤ تھا۔ ان کا بہت بڑا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں تقریباً ہر موضوع کی مناسبت سے عمدہ اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ علم دوست لوگوں اور بالخصوص ریسرچ سکالرز نے ان سے بہت استفادہ کیا۔ اُنھوں نے یہ کتابیں بہت محنت اور دُور دراز کے سفر کر کے جمع کی تھیں۔ اس مشینی دور میں یہ ذوق بہت قابلِ قدر ہے۔ علم و ادب کے فروغ کے حوالے سے ایسے لوگوں کا دم غنیمت ہے۔ اللہ انھیں آخرت کی راحتوں سے نوازے!

انسان کی ایک اچھی اور صحت مندانہ سرگرمی مطالعۂ کتب ہے۔ ایسی کتب جو انسان کو اخلاق و کردار، تہذیب و ثقافت اور مثبت معاشی اور سیاسی رویوں کی تشکیل میں راہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ نہ صرف فراغت کے لمحات گزارنے بلکہ ذہنی صلاحیتوں کی تقویت کا بھی باعث بنتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب لوگوں میں کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ وہ اچھی کتابوں کی تلاش میں دُور دراز کے سفر بھی کرتے اور لائبریریاں بھی کتب بینوں سے آباد رہتیں۔ پھر یوں ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ بہت فرق پڑ گیا اور آہستہ آہستہ مطالعۂ کتب کے رجحان کو شدید نقصان پہنچا۔ اب صورت یہ ہے کہ لائبریریاں تو ہیں جو کتابوں سے بھری پڑی ہیں، مگر گرد و غبار سے آلودہ، اس بات

Marfat.com

کی منتظر کہ کوئی آئے اور اِستفادہ کرے۔ گویا:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، راہرِو منزل ہی نہیں

کچھ ایسی ہوا چلی کہ رویوں، سرگرمیوں اور قدروں میں خوفناک قسم کی تبدیلی واقع ہو گئی۔ زندگی کچھ اس طرح مادیت کی لپیٹ میں آ گئی کہ ذہنی اور رُوحانی نشو و ارتقاء کی اہمیت کا احساس دم توڑنے لگا۔ بقول اقبال:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

اصل لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ علم و ادب کے مراکز یعنی لائبریریوں میں عام قاری تو در کنار اساتذہ اور طلبہ کی آمدورفت بھی بہت شاذ ہے۔ بس تحقیقی کام سے وابستہ کچھ لوگ دکھائی دیتے ہیں مگر اُن کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہے اور جو طلبہ وہاں جاتے ہیں ان کا مقصد پڑھنے سے زیادہ گپ شپ وغیرہ ہوتا ہے۔ ہم شاید سوچتے نہیں کہ لکھنے والوں نے کس قدر محنتِ شاقہ اور عرق ریزی سے کام کیا۔ بے شمار کتابیں تحریر کیں۔ اُن میں عہد بہ عہد عروج و زوال کے اسباب و واقعات بھی ہیں اور خوب سے خوب تر کے لیے جستجو کا سامان بھی۔

کتابیں لوگوں کے تجرباتِ زندگی اور مختلف حوالوں سے مفید معلومات کو آگے سے آگے منتقل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس سے آنے والی نسلیں گزری ہوئی نسلوں سے متعارف ہوتی ہیں۔ ماضی اور حال کے درمیان رابطہ اُستوار ہوتا ہے اور معاشرے میں علمی و تہذیبی تسلسل برقرار رہتا ہے۔

معاشرے کی تعمیر و تشکیل اور امن و امان کی فضا پیدا کرنے میں بھی علم و ادب اور مطالعۂ کتب کا بڑا کردار ہے۔ اگر ہم اس کی اہمیت کو محسوس کر لیں اور لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ کتب بینی کا شوق پیدا ہو جائے تو آوارگی اور بے راہروی پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے اور جرائم اور فتنہ و فساد کو بھی روکا جا سکتا ہے۔ کتاب کے ساتھ وابستگی اعتماد پیدا کرتی ہے، انسان کو حساس بناتی ہے اُسے تہذیب سے قریب تر کرتی ہے۔ فکرِ انسانی کا تقاضا ہے کہ تحقیقی انداز اپنایا جائے، عمدہ اور تحقیقی کتابوں کا مطالعہ معمولات میں شامل کیا جائے کیونکہ کتاب میں علم ہے اور علم روشنی ہے۔

□□□

Marfat.com

آؤ درخت لگائیں

انسان ترقی کرتے کرتے فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر چکا، بلند فضاؤں بلکہ خلاؤں کا سفر کر چکا اور سمندروں کی گہرائیاں ناپ چکا۔ جدید سائنسی ترقی کی بدولت زمانہ کیا سے کیا ہو گیا! انسان کے لیے قدم قدم پر سہولت اور آسائش کا سامان موجود ہے۔ مگر اس تمام تر جدت، بہتری اور ترقی کے پردے میں ایک تنزل کا پہلو بھی چھپا ہوا ہے۔ کارخانوں اور گاڑیوں کے شور اور دھوئیں سے فضا آلودہ ہو گئی۔ اب لوگوں کی اکثریت کو کھلی فضا، تازہ ہوا، اور صاف پانی میسر نہیں۔ فضائی آلودگی سے مختلف قسم کی خطرناک بیماریوں نے جنم لیا، صحت کے مسائل پیدا ہو گئے۔

معاشرتی فلاح و بہبود کا مقصد تب پورا ہوتا ہے جب افراد معاشرہ صحت مند ہوں۔ ترقی و خوشحالی کے فوائد و ثمرات سب تک پہنچیں تا کہ لوگ بڑھ چڑھ کر اجتماعی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

کائنات میں قدرت نے ہر مسئلے کا حل پیدا کیا ہے۔ اگر بیماری پھیلانے والے عوامل ہیں تو اُن کے تدارک کے لیے حفاظتی اقدامات بھی ہیں۔ اگر زہر ہے تو اُس کا تریاق بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے۔

کچھ کام ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کو ہنگامی بنیادوں پر انجام دیا جائے اور اُس میں سب لوگ اپنا اپنا حصہ ڈالیں تو بہت مفید نتائج سامنے آتے ہیں اور سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ فضائی آلودگی

Marfat.com

ہی کو لے لیجیے، بہت خطرناک صورتِ حال ہے لیکن اگر ہم یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہیں کہ یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہے، اس کا حل تنہا کسی شخص کے بس میں نہیں، اس کے لیے تو کسی بہت منظم منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ یقیناً ہے تو ایسا ہی، لیکن اس کے لیے ہر شخص اپنے طور پر بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ فضا کو صاف ستھرا اور خوشگوار رکھنے میں سرسبز و شاداب درختوں کا بڑا کردار ہے۔ بہت سے دوسرے فوائد کے ساتھ ساتھ درخت انسانی صحت اور تندرستی کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ یہاں تک کہ اگر فضائی آلودگی نہ بھی ہو، تو بھی درختوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب کے لیے آکسیجن کا واحد ذریعہ درخت ہیں۔ بلا وجہ درخت کاٹنے اور شجر کاری کی طرف توجہ نہ دینے سے فضا میں زہریلی گیسیں پیدا ہوتی ہیں اور آلودگی بڑھتی ہے۔ چنانچہ ماحول کو فضائی آلودگی سے بچانے کے لیے موجود درختوں کو بچانا اور نئے درخت لگانا اس قدر اہم ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قطرہ قطرہ مل کے دریا بن جاتا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر فرد ایک درخت بھی لگائے تو درختوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔ یوں ہمارے آنگن سے لے کر پورا ملک لہلہا اُٹھے گا۔ اس سے فضائی آلودگی کا مسئلہ بھی حل ہوگا جس کے انسانی صحت پر بہت اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔

درخت لگانا تو کچھ مشکل نہیں البتہ اُن کی حفاظت اور نگہداشت محنت طلب کام ہے اور یہی اصل بات ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شجر کاری تو ہر سال بہت شد و مد سے ہوتی ہے۔ لاتعداد درخت لگائے جاتے ہیں مگر مناسب توجہ اور دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث بہت کم پودے درخت بنتے ہیں۔

مسلمان کے لیے شجر کاری میں جو ترغیب کا پہلو رکھا گیا ہے وہ مادی فوائد سے ہٹ کر بھی ہے۔ اسلام میں اس کام کو بہت پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک ایسی نیکی جسے صدقہ جاریہ کی حیثیت حاصل ہے کہ خلقِ خدا جب تک مستفید ہوگی درخت لگانے والا عنداللہ ماجور رہے گا!

□□□

Marfat.com

رازی کا راز

علم وفن کی تاریخ میں رازی ایک بڑا نام گزرا ہے۔قرونِ وسطیٰ کی اس شخصیت نے علمِ طب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔طب میں جدت پیدا کی اور اس علم کو سائنسی بنیادوں پر اُستوار کیا۔اُس کی شہرۂ آفاق تصنیف ''الحاوی'' علم طب کے حوالے سے انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے جو نظری و عملی طب کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔مشرق و مغرب میں رازی کے کارہائے نمایاں کا اعتراف کیا گیا۔اسلامی تاریخِ علوم میں رازی کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

محمد بن زکریا الرازی کا کمالِ فن تو علمِ طب کے حوالے سے منظرِ عام پر آیا مگر اُس کے اس فنی سفر کا آغاز علمِ کیمیا سے ہوا تھا۔کہا جاتا ہے کہ رازی ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔تعلیم بھی کوئی خاص حاصل نہ کر سکا۔البتہ قدرتی طور پر ذہین و فطین بہت تھا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وقت یوں ہی بے کار گزرتا رہا۔ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔اُسے ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی تعمیری کام کرنا چاہیے۔

رازی نے سوچا کہ کیوں نہ کیمیا گری میں طبع آزمائی کی جائے۔اس طرح وہ مصروف بھی رہے گا اور مالی فوائد بھی حاصل ہو جائیں گے۔چنانچہ اُس نے سونا بنانے کا فیصلہ کر لیا۔گھر کے اندر آگ کی بھٹی تیار کی اور تمام لوازماتِ فن جمع کر کے ہمہ تن اور ہمہ وقت اس کام میں مصروف ہو گیا۔سارا سارا وقت آگ اور دھوئیں میں پھونکیں مارتا رہتا۔طویل عرصہ یونہی گزر گیا۔بہت سا

Marfat.com

پیسہ خرچ ہو گیا۔ دھوئیں سے آنکھیں خراب ہو گئیں مگر سونا بنانے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آشوبِ چشم بڑھ گیا اور بینائی جاتی رہی۔

بالآخر ایک طبیب نے اُس کی آنکھوں کا کامیاب علاج کیا۔ اُس طبیب نے رازی سے ایک راز کی بات کہی تھی کہ کیمیا وہ نہیں جو تم کرتے ہو بلکہ کیمیا تو یہ ہے جس سے تمہاری بیماری کا کامیاب علاج ہوا ہے۔

طبیب کی اس بات نے رازی کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہی لمحہ اُس کی زندگی میں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ زاویۂ فکر بدل گیا اور اُس نے اپنے سفر کا رُخ کیمیا سے طب کی طرف موڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا رازی نے کیمیا کا حقیقی راز پا لیا تھا۔ یہ ذوقِ جستجو تھا کہ اُس نے طب کا باقاعدہ علم حاصل کرنے کا تہیہ کیا۔ اُس وقت اُس کی عمر ۴۰ سال کے قریب تھی۔ حصولِ علم کے لیے اُس نے بغداد کا سفر اختیار کیا جو اُس زمانے میں اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔

زندگی کے سفر میں خوب سے خوب تر کی تلاش بالآخر انسان کو ترقی اور کامیابی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ بشرطیکہ اُس کے اندر خود اعتمادی اور آگے بڑھنے کا جذبہ ہو۔ وہ لوگ جو دوسروں سے مشورہ لینے میں عار سمجھتے ہیں، کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے، غلط یا صحیح ہمیشہ اپنی ہی دُھن میں لگے رہتے ہیں، وہ اکثر خاطر خواہ نتائج سے محروم رہتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو ترقی اور کامیابی کو زندگی کے ایک خاص حصے تک محدود تصوّر کرتے ہیں اور عمر کا وہ حصہ گزرنے پر سمجھتے ہیں کہ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر حصولِ علم کے حوالے سے ایسی سوچ تو عام پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا! اور ویسے بھی اصولِ فطرت ہے کہ کوشش اور عمل کا صلہ تو انسان کا مقدر ہے۔

رازی کی زندگی ایک ایسی ہی مثال ہے جس نے تعمیر کی طرف قدم بڑھایا، جس نے ایک خیر خواہ کی نصیحت کا اثر قبول کیا، اور جس نے جوانی گزرنے کے بعد بھی حصولِ علم میں کوئی عار نہ سمجھی۔ نتیجتاً مثبت سوچ اُس کے تمام منفی رویوں پر غالب آ گئی، پچھلی تمام کوتاہیوں کی تلافی ہو گئی اور رازی کا نام آسمانِ علم ودانش کا ستارہ بن گیا، جس کی روشنی اب بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

□□□

Marfat.com

کھانے پینے کے آداب

انسان دوسری ہر مخلوق سے ممتاز ہے۔ انسانی زندگی ایک ضابطے اور نظم کی متقاضی ہے۔ ضابطے کی پابندی ہی اصل میں حُسنِ زندگی ہے۔ اس سلسلے میں فطری نظامِ زندگی یعنی خالقِ کائنات کا دیا ہوا نظام ہدایت بہترین ضابطۂ ہدایت ہے، جس کا بڑا حصہ اخلاقیات سے عبارت ہے۔ اخلاقیات میں کھانے پینے کے آداب کا بڑا عمل دخل ہے۔ کھانا پینا زندگی کا جزو لازم ہے مگر انسان کو اس سلسلے میں کچھ آداب کا پابند کیا گیا ہے۔ وہ آداب کسی دوسری مخلوق کے لیے نہیں صرف انسان کے لیے ہیں۔ اس فرق کا قائم رہنا بہت ضروری ہے۔

خورونوش کے معاملے میں جس بنیادی بات کا لحاظ لازم ہے، وہ حلال وحرام کی تمیز ہے۔ صرف رزقِ حلال کھانا ہے اور حرام کے قریب نہیں جانا۔ اس ضمن میں دو باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ ایک یہ کہ کھائی جانے والی شے فی نفسہٖ پاکیزہ ہو یعنی جس شے کو شریعت نے طیب قرار دیا ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ شے حلال طریقے سے کمائی گئی ہو۔ اُس کے حصول میں انسان کی نیک نیتی اور محنت شامل ہو۔ حلال وحرام کی تمیز اس قدر اہمیت کا حامل عنوان ہے کہ اس کے بغیر انسان اور حیوان کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ انسان کو اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ حرام خوری کی ہر شکل دُعاؤں کی قبولیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ نیز رزقِ حرام کے مضر اور تباہ کن اثرات نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں، اس لیے کھانے پینے میں رزقِ حلال کا

Marfat.com

اہتمام از حد ناگزیر ہے۔

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تعلیم بھی انسان کے لیے ہے۔ظاہر ہے کہ یہ کام بھی انسان ہی کرسکتا ہے۔کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوکر تولیے وغیرہ سے خشک نہ کیے جائیں، اس میں طبّی مصلحت کارفرما ہے۔ہاتھ دھونے کا فلسفہ یہ ہے کہ میل کچیل اور جراثیم وغیرہ کھانے کے ساتھ جسم کے اندر داخل نہ ہو جائیں۔اسی لیے کھانے سے پہلے تولیے کا استعمال درست نہیں البتہ کھانے کے بعد ہاتھ دھوکر ضرور خشک کر لینے چاہئیں۔

کھانے پینے کے آداب کے سلسلے میں یہ بات بہت ضروری ہے کہ کھانا ''اللہ'' کے نام کے ساتھ شروع کیا جائے جو رازق حقیقی ہے۔یعنی ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کہا جائے۔ ہر جاندار کا رزق چونکہ صرف اللہ کے اختیار میں لہٰذا اُسے چھوڑ کر کسی اور کا نام لینا حماقت بھی ہے اور ظلم بھی۔اللہ ہی کا حق ہے کہ انسان ہمیشہ اچھا کام کرے اور ہر کام کی اِبتدا اُسی کے نام سے ہو تا کہ خیر و برکت حاصل ہو سکے۔کھانے کے بعد ضروری ہے کہ اللہ کا شکر بجالایا جائے۔ شکرِ نعمت سے رزق بڑھتا ہے جب کہ ناشکری کرنے سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔فرمایا گیا کہ ''اگر تم شکرادا کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔'' معلوم ہونا چاہیے کہ دینے والا واپس لینے پر بھی قادر ہے۔اس کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے یہ بندگی کا تقاضا ہے۔

کھانے کے معاملے میں دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ضرورت سے زیادہ کھا لیتے ہیں۔ ایسا عام طور پر تقریبات میں ہوتا ہے۔ایسا کرنا کھانے کے آداب کے خلاف ہے۔کھانا اصل میں جسمانی صحت اور تندرستی کے لیے کھایا جاتا ہے لیکن بے تحاشا کھانا بیماری کا موجب ہے۔اس لیے اپنے ہی فائدے کے لیے احتیاط کر لینی چاہیے۔حدِ اعتدال میں رہ کر ہی بیماری اور پریشانی سے بچا جاسکتا ہے۔

ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ کھانا بیٹھ کر کھایا جائے خواہ زمین پر یا کرسی وغیرہ پر۔ البتہ زمین پر بیٹھنے میں زیادہ عاجزی ہے۔کھانے کے لیے اس انداز سے بیٹھنا کہ انسان کی اللہ کے حضور عاجزی وانکساری اور بندگی کا بھی اظہار ہو اور اُس سے انسانی وقار کا بھی پتہ چلے بہت

Marfat.com

ضروری ہے۔ کھڑے ہو کر اور چل پھر کھانے پینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔اس سے بھی انسان کی پہچان میں وقار پیدا ہوتا ہے۔

خورونوش کے سلسلے میں یہ چند باتیں ان آداب کا خلاصہ ہیں جو دینِ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو سکھائے ہیں۔ یہ باتیں اسلامی تہذیب کا حصہ ہیں اور یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ اقوامِ عالم کے در و دیوار اصل میں اسلامی تہذیب و تعلیم کی روشنی سے منور ہوئے تھے۔

□□□

Marfat.com

جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو؟

ایک صاحب تمباکو نوشی کے نقصانات (Anti Smoking) کے موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے بہت پُرزور اور سیر حاصل تبصرہ کیا اور تمباکو نوشی کے مضر اثرات پر ایسے ایسے منطقی دلائل پیش کیے کہ سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بہت سے لوگوں نے تمباکو نوشی کی عادت ترک کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ مگر اُس وقت مجمعے کی حیرت اور پریشانی کی انتہا نہ رہی جب تقریر ختم کرتے ہی اُن صاحب نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگا کر نوشِ جاں کرنے لگے۔ پتہ چلا کہ وہ تو ایک رسمی کارروائی انجام دینے کے لیے تقریر کرنے آئے تھے جب کہ وہ خود سگریٹ کے عادی تھے۔ اس تضاد نے مجمعٔ عام پر بہت منفی اثر ڈالا۔ ایک تو لوگ سگریٹ کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوئے اور دوسری طرف اُن کا حضرتِ واعظ پر سے اعتبار اُٹھ گیا۔

اصل میں قول بغیر عمل کے ایسے ہی ہے جیسے سر کے بغیر دھڑ یا دیواروں کے بغیر گھر۔ پریکٹیکل کے بغیر تھیوری تصوّر محض ہوتا ہے۔ چنانچہ قول و عمل میں ہم آہنگی لازم ٹھہری۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ عمل کے تکلف سے بچنے کے لیے بلند بانگ دعوؤں کا سہارا لیتے ہیں اور دوسروں کو اُن کاموں کی ترغیب دلاتے ہیں جو وہ خود نہیں کرتے یا کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ خود تو بات بات پر جھوٹ بولنا، ناپ تول پورا نہ کرنا، دوسروں کے کام آنے سے کترانا، انصاف کے تقاضے پورے نہ کرنا مگر دوسروں کو سچائی، دیانتداری اور عدل و احسان کی تلقین کرتے نہ تھکنا ایسا

Marfat.com

رویہ ہے جس سے تاثر بگڑ جاتا ہے۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ''خود میاں فضیحت اوروں کو نصیحت'' ایسے شخص کے منہ سے اچھائی کی تبلیغ خود اچھائی اور اچھے لوگوں کے ساتھ مذاق کے مترادف ہے، جس کے باعث اس رویے کو پسند نہیں کیا گیا۔ قرآن میں ایسے لوگوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ ''لِمَ تقولون مالاتفعلون'' یعنی تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن پر خود عمل نہیں کرتے؟

اسلام میں ایسے رویے کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے کہ انسان کہے کچھ اور کرے کچھ، یا دوسروں کو تو اچھائی کا درس دے مگر خود اس کے برعکس عمل کرے۔ قول بلا عمل جھوٹ کی قسم ہے اور جھوٹ انسانی کردار کی سب سے بڑی خرابی۔ اس کا دوسرا نام منافقت ہے، اچھائی کے نام پر خود فریبی اور دھوکہ دہی۔ اس عادت سے انسان کا وقار اور اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ ایسے شخص کو ایک دفعہ سنیں گے، دو دفعہ سنیں گے، بالآخر اصلیت سے آگاہ ہو کر متنفر ہو جائیں گے۔ ایسے شخص کے گویا دو چہرے ہوتے ہیں یعنی دوہرے معیار یا دوہرے کردار کا حامل۔ قیامت کے دن کچھ لوگوں کے دو دو چہرے دیکھنے کو ملیں گے جو اس بات کی علامت ہو گی کہ وہ دُنیا کی زندگی میں قول و فعل کے تضاد کا شکار رہے ہیں۔

اعلیٰ انسانی قدروں کی بنیاد سچ بولنا اور قول و فعل کی ہم آہنگی ہے۔ اس سے انسان کے کردار میں پختگی آتی ہے اور لوگوں کے درمیان باعزت مقام ملتا ہے۔ دینِ فطرت سب سے زیادہ سچائی کا علمبردار ہے اور جھوٹ کی ہر شکل سے نفرت کرتا ہے۔ اس اَمر پر زور دیا جاتا ہے کہ انسان وقتی مصلحت، ذاتی مفاد اور کسی دباؤ وغیرہ سے بالاتر ہو کر اپنی ترجیحات کو ازسرِ نو مرتب کرے اور اس بات کو اہمیت دے کہ اُس کے قدم حقیقی فلاح کی طرف اُٹھیں۔ ایسا نہ ہو کہ عارضی فائدے اور جھوٹی شہرت کے لالچ میں اصل فائدے سے محروم ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے حسرت و شرمندگی اُس کا مقدر بن جائے۔

انسانی مقام کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اندھیروں سے بچے اور روشنی کو تلاش کرے، ایسی روشنی جو قلب و نظر کو منور کر دے، انسان کو فکر و عمل کے تضاد سے بچائے اور بلند کرداری کی راہ دکھائے۔

□□□

Marfat.com

دین خواہشات کو کچلتا نہیں

انسانی عمل کا محرک خواہشِ نفس ہے۔ اچھی خواہش کے نتیجے میں اچھا عمل صادر ہوتا ہے، جب کہ برای کے نتیجے میں بُرا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خواہشِ نفس ایک ایسے ضابطے کی پابند رہے جو حق وصداقت پر مبنی اور فطرت کی پکار ہو تا کہ ہمیشہ اچھی خواہش ہی جنم لے۔ خواہش اگر بے لگام ہو جائے تو انسان کی زندگی میں کبھی بھی خیر وخوبی اور تہذیب وشائستگی نہیں آ سکتی۔

انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں کہ خواہشِ نفس کی آوارگی نے انسان کو خودسر، خود پسند اور خود پرست بنا دیا اور اس حالت تک پہنچا دیا جہاں انسان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کی تعلیمات سے انحراف اور اُن کی مخالفت خواہش کی آوارگی ہی کا نتیجہ رہا ہے جس نے انسانی کردار وعمل کا حلیہ بگاڑا اور معاشرہ فساد زدہ ہوا۔

چنانچہ دینِ فطرت بنیادی طور پر انسان کی خواہشِ نفس کی راہ تسکین کا تعین کرتا ہے۔ یعنی اللہ کا دین انسانی خواہشات کو دباتا اور کچلتا نہیں بلکہ ایک ضابطے کے تحت لاتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ انسان اپنی کسی بھی خواہش کو بے لگام نہ ہونے دے، خواہش کو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ خالقِ کائنات کی مشیت کے مطابق پورا کرے تا کہ اُس سے مثبت نتائج برآمد ہوں۔ انسانی زندگی کے لیے یہ اتنی اہم بات ہے کہ دینِ اسلام ایمان کو اس کے ساتھ مشروط کرتا ہے۔ حضور پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

Marfat.com

''تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔''

دوسرے لفظوں میں خواہشِ نفس کو دین (شریعتِ محمدی ﷺ) کے تابع کر دینا ہی اصل میں ایمان لانے اور مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ اسلام اہلِ ایمان سے اس کا عملی تقاضا کرتا ہے۔ لمحۂ فکریہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ دار ہے۔

دینِ اسلام انسان کو خواہشِ نفس کی غلامی سے بچانے کے لیے اس ماخذ کی نشاندہی بڑی وضاحت کے ساتھ کرتا ہے جہاں سے اس خرابی کا آغاز ہوتا ہے اور شر و فساد کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ برائی کے اس ماخذ کا نام شیطان ہے۔ قرآنِ حکیم انسان کی ابدی خیر خواہی کرتے ہوئے شیطان کی ازلی انسان دُشمنی کا حوالہ دیتا ہے اور اُس کی پیروی سے روکتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا کہ:

''اے اہلِ ایمان! دائرۂ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کیا کرو۔ بے شک وہ تو تمہارا کھلا دُشمن ہے۔''

بھلا اپنے دُشمن کی بھی کوئی پیروی کرتا ہے! اور شیطان تو انسان کا بدترین دُشمن ہے۔ اُس سے خیر خواہی کیونکر ممکن ہو گی جس کا مقصدِ وجود ہی شر انگیزی کرنا اور انسان کو خواہش کا غلام بنا کر اس کی ذِلت و رُسوائی کا سامان کرنا ہے۔ اس تکلیف دہ ذلت آمیز کیفیت سے بچنے کا واحد بہترین راستہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانا یعنی خواہشِ نفس کو دین کے تابع کر دینا ہے۔ اسلام کا تو معنی ہی اپنے آپ کو ربِّ کائنات کے سپرد کرنا یعنی اس کے حکم اور قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہے جو دینِ فطرت کی رُوح ہے۔

□□□

Marfat.com

دورِ جاہلیت کے تازہ شاخسانے

ایک زمانہ تھا کہ ہر کوئی دوسرے کے خون کا پیاسا تھا اور انتقام کے جوش میں تمام اخلاقی حدود کو پھلانگ جاتا۔ انتقام کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا، مرنے والا بڑے اہتمام سے اپنے ورثاء کو وصیت کرتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے بعد انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔

نہ جانے اُس آگ کو جلتے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا تھا! کتنی نسلیں اُس میں بھسم ہو گئیں! جو بھی اُٹھتا جلتی پر تیل ہی چھڑکتا۔ انسانیت کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور قدریں پامال ہوتی رہیں — ذہنی آلودگی کے اس دور کو تقریباً تمام مؤرخین نے دورِ جاہلیت کا نام دیا جس میں ہر بُرائی اپنے عروج پر دکھائی دی۔ انتقام لینے کو شجاعت اور جوانمردی سمجھا جاتا، جو ایسا نہ کرتا اُسے بزدلی اور کم ہمتی کا طعن دیا جاتا۔

پھر یکا یک زمانہ کروٹ بدلتا ہے۔ ''مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّور'' کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ رُشد و ہدایت کی روشنی کا سفر، ایک پیغام ہدایت اُترتا ہے، جو گمراہی کی تاریکیوں کو چیرتا ہوا سپیدۂ سحر بن کر دل و دماغ کو منور کر دیتا ہے، فکر کو تازگی دیتا ہے۔ انسان دوستی اور محبت کا پیغام جس نے آتشِ انتقام کو بجھا دیا، خون آشام تلواریں اپنے اپنے نیام میں واپس چلی گئیں، رِستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھ دیا گیا، نفرتیں مٹ گئیں اور لوگ باہم شیر و شکر ہو گئے۔ معاشرہ حُسنِ معاشرت سے آراستہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اقوامِ عالم کے لیے قابلِ رشک نمونہ بن گیا۔

Marfat.com

یہ اسلامی معاشرہ تھا جو حقیقت پسندی اور حق پرستی کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا۔ اسی تعلق کی بدولت جو ہر قسم کے مادی مفادات سے بالاتر ٹھہرا اور اسی بناء پر یہ عالمگیر معاشرہ کہلایا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی بقا اور سلامتی اس کی اپنی بنیاد کے ساتھ وابستگی میں مضمر ہوتی ہے کیونکہ:

ڈالی گئی فصلِ خزاں میں جو شجر سے ٹوٹ کر
ممکن نہیں ہری ہو پھر سحابِ بہار سے

کے مصداق کوئی بھی قوم من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اندازہ کیجیے کہ جس قوم کی بنیاد لازوال ہو، سراسر خیر و خوبی سے عبارت ہو، اُس سے الگ تھلگ رہ کر وہ بھلا حقیقی اور ابدی فوائد و ثمرات کیسے حاصل کر سکتی ہے!

معاشرہ ایک بار پھر معاشرتی قدروں سے دُور ہو رہا ہے۔ باہمی احترام کا فقدان ہے۔ اعلیٰ قدروں کو قدامت پسندی کا نام دیا جاتا ہے، وراثت اور جائیداد وغیرہ کے جھگڑے قتل و غارت گری پر منتج ہو جاتے ہیں۔ ذات پات کے غیر انسانی تصوّر نے بے جا برتری اور کمتری کے احساس کو ہوا دے کر نفرت اور کشیدگی میں اضافہ کیا ہے۔

انتقام کا وہی سلسلہ جو جہالت اور گمراہی کی پیداوار تھا، علم و دانش اور روشن خیالی کے باوجود شرمندگی کا باعث بنا ہوا ہے۔ غیبت کے بغیر ہم رہ نہیں سکتے! جھوٹ کے بغیر کہتے ہیں کہ گزارہ نہیں ہوتا۔ دھوکہ دہی اور فریب کاری کو ذہانت کا نام دیتے ہیں۔ دوسروں کے لیے مسائل اور مشکلات پیدا کرنا اور ان کو پریشان کرنا اپنے بڑا ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔

لمحہ فکریہ ہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنی اصل سے دُور ہو گئے ہیں، اپنی پہچان کھو رہے ہیں اور اپنے تشخص کو عار سمجھتے ہیں۔ وہ اصل کہ جس نے انتشار زدہ معاشرے کی شیرازہ بندی کی تھی۔ وہ پہچان کہ جس کی بدولت انسان نے اپنے مقصدِ زندگی کو پہچانا تھا۔ وہ تشخص کہ جس نے انسان کو معزز، محترم اور معتبر کر دیا تھا۔ کیا ہم اُس بات سے عار محسوس کرتے ہیں جس میں ہمارے لیے بقاو سلامتی، صلح و آشتی اور فوز و فلاح کی ضمانت ہے؟

□□□

Marfat.com

نرم رویہ کمزوری نہیں!

ایک عام سے آدمی نے بھرے مجمع میں اُٹھ کر کہا کہ ایک چادر سے تو آپ کی قمیص نہیں بن سکتی تھی! بتایئے دوسری چادر کہاں سے آئی؟ خلیفہء وقت نے کھلے دِل اور خندہ پیشانی سے اعتراض کرنے والے کا اعتراض سنا اور بہت نرمی سے معاملے کی وضاحت فرما دی۔ اس بات کو بالکل بھی اَنا کا مسئلہ نہیں بنایا کہ ایک عام سا شخص حاکمِ وقت سے باز پُرس کر رہا ہے۔

نرم رویہ اور پیار کی زبان اچھے اور عمدہ اخلاق کی علامت ہے۔ جب تک رویے میں نرمی اور زبان میں مٹھاس نہ ہو، دوسروں کو نہ تو متاثر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اچھے مقصد کا حصول ممکن ہے۔ حقیقی قدر و منزلت اُنھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو دوسروں کی عزت کرتے ہیں، اُن کی بات توجہ سے سنتے ہیں، نرمی سے پیش آتے ہیں اور اپنی اَنا کی خاطر کسی کو حقیر نہیں جانتے۔

معاشرے میں بہت سی خرابیوں کی صرف یہ وجہ ہوتی ہے کہ لوگوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ والدین اولاد پر بے جا سختی کرتے ہیں تو بچے منہ پھٹ اور بد اخلاق ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ کا ضرورت سے زیادہ سخت رویہ شاگردوں کو بدلحاظ بنا دیتا ہے۔ افسروں کی سخت مزاجی ماتحتوں میں نفرت کا جذبہ اُبھارتی ہے اور حکمرانوں کا رعایا کو نظر انداز کرنا آپس میں اُلجھنیں اور دُوریاں پیدا کر دیتا ہے۔

یہ کوئی سنی سنائی یا افسانوی بات نہیں بلکہ آپ جانتے ہیں کہ تاریخ میں ایسے کئی واقعات

Marfat.com

ملتے ہیں کہ بادشاہوں نے لوگوں سے ناراض ہو کر اُنھیں سخت سے سخت سزائیں دیں۔ کسی کا گھر مسمار کر دیا گیا تو کسی کا مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور کسی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ یہ تو اعزاز ہے دینِ فطرت کا جس نے ہر جابرانہ اور ظالمانہ نظام کی جڑ کاٹی، معاشرے کو ہر لحاظ سے اصلاح و فلاح سے ہمکنار کیا، اسے متوازن بنایا، برائی کو اچھی کے ذریعے دُور کرنے کی تعلیم دی اور باہمی امور و معاملات میں سختی کی بجائے نرمی، برداشت اور مشفقانہ طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی کی۔

دوسروں کو نیچا دکھانا، حقیر سمجھنا اور بغیر سوچے سمجھے سختی کی زبان میں بات کرنا غیر فطری سا رویہ ہے جو بداخلاقی کی علامت ہے، جس کی وجہ غرور اور تکبر ہے۔ غرور انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اس منفی رُجحان کی بدولت انسان انسان کا دُشمن بن جاتا ہے، اپنے مقام سے گر جاتا ہے اور ماحول کو خراب کر دیتا ہے۔ انسان میں اعلیٰ اخلاقی اوصاف و اقدار کا پیدا ہونا بہت ضروری ہے۔ طرزِ عمل اور گفتگو میں نرمی اور شفقت اُنھی اوصاف میں سے ہے۔ یہ بہت بڑا انسانی وصف ہے جس کی وجہ سے ایک شخص دوسروں کی نظروں میں عظیم بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لمحۂ فکر یہ ہے کہ کسی کو اخلاقی طور پر گر جانا چاہیے یا عظیم لوگوں کی صف میں شامل ہونا چاہیے۔ فیصلہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے! جیسا چاہے راستہ اختیار کر لے۔

کچھ لوگ نرم اور مشفقانہ رویے کو کسی کی کمزوری سمجھتے ہیں اور اس کا طعنہ دے کر عار دلانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ محض طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے دوسروں پر سختی کرنا اور تندخوئی سے پیش آنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں۔ غصے کی حالت میں ہوش و حواس میں رہنا، درگزر کرنا، نرمی سے بات کرنا تو بہت مشکل کام ہے۔ یہ تو کسی کی اولوالعزمی کی علامت اور قدرت کی بہت بڑی عطا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ جسے یہ نعمت ملی ہو، اِسے کسی کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ صفت تو سب سے پہلے اللہ کی ہے جس کی قدرت ہر طرح کی عظمت و رفعت اور قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ نرمی کرنے والی اور مہربان ذات ہے۔ اُس نے یہ صفت سب سے زیادہ انبیائے کرامؑ میں رکھی۔ قرآن نے اُن کے حوالے سے اس صفت کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے اور حضور ختم الرسل ﷺ کی نرم خوئی کا بطورِ خاص حوالہ دیتے ہوئے، دعوتِ دین کے عظیم اور مشکل مشن کی اشاعت میں اس وصف کا سب سے زیادہ عمل دخل قرار دیا ہے۔ فرمایا گیا کہ اگر آپ ﷺ نرم خو نہ ہوتے تو لوگ آپ سے دُور بھاگ جاتے۔

Marfat.com

تکیہ کلام

مختلف لوگ مختلف عادات سے پہچانے جاتے ہیں۔بعض کی پہچان اُن کا تکیہ کلام ہوتا ہے جو بہت اچھا بھی ہوسکتا ہے جب کہ وہ حُسنِ اخلاق پر مبنی ہو۔حُسنِ اخلاق عظمتِ کردار کی دلیل ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کے اخلاق و کردار میں سب سے زیادہ زبان اور گفتگو کا دخل ہے۔زبان کے استعمال میں احتیاط اہم اخلاقی تقاضا ہے۔اگر یہ تقاضا ملحوظِ خاطر رہے تو زبان سے یقیناً کلمہ خیر ہی نکلتا ہے اور اس صورت میں تکیہ کلام بھی اچھا اور عمدہ ہوتا ہے۔لیکن اگر مذکورہ تقاضا نظرانداز کردیا جائے تو نتیجہ اُلٹ ہوجاتا ہے۔

آپ نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہوگا جو بے دھڑک بدکلامی اور فحش گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ایک ایسا ہی شخص تھا جو خاص مہارت سے اپنی گفتگو کے دوران فحش کلامی کی تکرار کررہا تھا۔راہ گیر گزر رہے تھے۔کچھ لوگ اُسے دیکھ اور سن بھی رہے تھے، مگر وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر مسلسل اپنی پسندیدہ بدکلامی کا مظاہرہ کرتا رہا۔غالباً اُس کے مزید شر کے خوف سے کسی نے بھی اُس کو روکا نہیں۔البتہ کسی راہ گیر نے وہاں کسی سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے؟ ایسا کیوں کررہا ہے؟ کس کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے؟ پتہ چلا کہ کسی کو بھی نہیں، بلکہ یہ تو اس کی معمول کی گفتگو ہے اور فحش گوئی اس کا تکیہ کلام ہے۔

لوگ بتاتے ہیں کہ وہ ساری زندگی فحش کلامی کی مشق کرتا رہا۔بڑھاپے میں اُس کی یہ

Marfat.com

عادت پاگل پن کی صورت اختیار کر گئی اور مرتے وقت بھی اُس کی زبان پر کلمۂ شر ہی جاری رہا۔

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب تک وہ بے ہودہ گفتگو نہ کر لیں اُن کو بدہضمی رہتی ہے۔ ہمارے وہ دوست کوئی ڈاکٹر یا حکیم تو نہیں کہ اُن کی اس بات کو طبی تحقیق کا نام دیا جائے بلکہ یہ تو اُن کا اندازِ شکایت ہے کہ قدرت نے انسان کو کیا خوبصورت پیدا کیا ہے! اسے بہترین مخلوق بنایا ہے۔ کتنی اچھی اور خوبصورت زبان دی ہے! مگر یہ کیسا ناشکرا ہے کہ جس طرح بولنا چاہیے اِسے بولنا ہی نہیں آتا! یہ بلا روک ٹوک زبان کا غلط استعمال کرتا ہے اور بے ہودہ گفتگو کو تکیۂ کلام بنالیتا ہے۔

انسان کی زبان تو اُس مخلوق کی زبان ہے جسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا ہوئی، مگر وہ زبان پر بدکلامی لاتے وقت سوچتا ہی نہیں کہ اخلاقی طور پر وہ کتنا زیادہ گر گیا ہے! سوچتا ہی نہیں کہ اس کے ربِ کریم خالق نے تو اس سے حُسنِ گفتار اور کلمۂ خیر کا تقاضا کیا ہے۔ کیا یہ اتنا ہی مشکل کام ہے کہ انسان اپنی ہی زبان کو لگام نہ دے سکے! اور بداخلاقی اور فحش کلامی کے مظاہرے سرِ عام کرتا پھرے۔

حیرت کی بات ہے کہ انسان ویسے تو بہت عقل مند اور علم جُو بنتا ہے۔ آسمان سے تارے توڑ لانے کی باتیں، مشکل سے مشکل کام کو چیلنج سمجھ کر کرنے کی کوشش، مگر دوسری طرف بزدلی کی انتہا کہ گفتگو میں احتیاط اور تکیۂ کلام کے انتخاب میں مار کھا جاتا ہے۔

ایک بستی میں رواج تھا کہ بے ہودہ گوئی پر سزا دی جاتی تھی چنانچہ آہستہ آہستہ وہاں کا رہنے والا ہر کوئی بات کرنے میں حد درجہ محتاط ہو گیا۔ اس سے ماحول بڑا ہلکا پھلکا سا، خوشگوار سا نظر آنے لگا۔ بستی کا یہ انداز اتنا دلکش اور پسندیدہ ثابت ہوا کہ اُس کا نام ہی ''خوش گفتار بستی'' مشہور ہو گیا۔ اتفاق سے ایک اجنبی شخص کا تکیۂ کلام اچھا نہیں تھا، اُدھر آ نکلا اور حسبِ عادت اپنے خاص انداز میں لوگوں کو مخاطب کرنے لگا۔ لوگوں نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ بستی والوں نے اُسے سبق سکھانے کے لیے قید کر دیا۔ تب اُسے اپنی حرکت کی سنگینی کا احساس ہوا اور پتہ چلا کہ بدکلامی واقعی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے جو انسانی کردار اور تہذیب کی خرابی کا باعث ہے۔ بہت ضروری ہے کہ انسان کا تکیۂ کلام کلمۂ خیر پر مبنی ہو۔

□□□

Marfat.com

سنی سنائی بات کی تشہیر

کہنے لگا فُلاں آدمی تو بہت بُرا ہے۔ اُس میں فُلاں فُلاں بُرائی پائی جاتی ہے۔ پوچھا گیا! کہ آپ اسے کب سے جانتے ہیں؟

کہا کچھ زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا، لیکن جب سے بھی جانتا ہوں یہی جانتا ہوں کہ وہ اچھا نہیں۔ پوچھا گیا کہ اُس نے آپ سے کیا بُرائی کی؟

کہا کہ کوئی بھی نہیں، اُس نے میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں کیا۔

پوچھنے والے نے نہایت حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ پھر وہ بُرا کیسے ہو گیا جبکہ آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں!

کہنے لگا: اجی بس، سب یہی کہتے ہیں کہ وہ بُرا ہے، لہٰذا بُرا ہے۔

بات یہ ہے کہ سنی سنائی باتوں کو بغیر سوچے سمجھے آگے سے آگے پھیلانا معاشرے کے لیے بہت خطرناک رُجحان ہے اور اس کے کئی مذموم پہلو ہیں۔

اوّل تو یہ رُجحان اس لیے ناپسندیدہ ہے کہ یہ ناقص سوچ اور کج فہمی پر مبنی ہے، عقل وفہم اور سمجھداری کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ جبکہ انسان کو سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ بات کرنے سے پہلے خوب سوچنا انسان کی خوبی ہے۔

دوسرے یہ کہ جس بات کو اصلیت جانے بغیر پھیلایا جائے وہ جھوٹ کے مترادف ہوتی

Marfat.com

ہے اور جھوٹ انسانی کردار کی سب سے بڑی خامی ہے۔ ممکن ہے کہ اُس بات میں کسی حد تک یا بہت حد تک صداقت ہو، لیکن چونکہ بات کرنے والے کی اُس پر تحقیق نہیں ہوتی اور صداقت کو جانچنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہوتی لہٰذا وہ بات برائے بات اور ایک جھوٹے شخص کی بات قرار دی جائے گی۔

نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایسی شفاف اور مسلمہ حقیقت ہے جو اظہر من الشمس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ''اَصدق الناس'' ذات ہے۔ دینِ فطرت روشن حقیقت ہے جس کی شہادت اللہ نے دی۔ ایسی ازلی وابدی صداقت کہ جس میں کوئی شک نہیں مگر جب مُنافقوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو اللہ نے اُن منافقین کو جھوٹا قرار دیا تھا کیوں کہ وہ سچ بولنے میں مخلص نہیں تھے۔

گویا جس بات میں خلوص نہ ہو، جو بات دل سے نہ کی جائے، اور سوچے سمجھے بغیر زبان سے نکال دی جائے وہ جھوٹ ہوتی ہے۔ ایسی بات شرانگیزی کا باعث بنتی ہے۔ فرمانِ نبوت ہے کہ'' آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کیے آگے بیان کردے۔'' جھوٹ کی شدت یہ ہے کہ انسان دنیا میں اعتبار کھو دیتا ہے اور آخرت میں ناکام ونامراد رہتا ہے۔

پھر یہ کہ سوچے سمجھے بغیر کسی کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کرنا بدگمانی بھی تو ہے، جو بذاتِ خود بہت بڑا گناہ ہے۔ بھلا یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ محض دوسروں کی باتوں میں آکر کسی کے بارے میں ایسی رائے قائم کرلی جائے جس سے کسی کے دل میں نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوجائیں۔ انسان کی رائے اور اُس کے فیصلے کی آخر کوئی تو ٹھوس بنیاد ہونی چاہیے۔

سنی سنائی باتوں کی تشہیر کا ایک اور مذموم پہلو یہ ہے کہ ایسا کرنا غیبت کے زمرے میں آتا ہے اور بعض اوقات بہتان بھی بن جاتا ہے، جو بہت سنگین قسم کی بداخلاقی ہے۔ کسی کی عدم موجودگی میں محض کسی کو بدنام کرنے کی خاطر اُس پر کیچڑ اُچھالنا جبکہ اصلاح مقصود نہ ہو، اتنی زیادہ قابل نفرت و مذمت حرکت ہے کہ گویا اس کا ارتکاب کرنے والا اپنے ہی بھائی اور وہ بھی مُردہ بھائی کا گوشت نوچتا اور کھاتا ہے۔

□□□

Marfat.com

اقبال بھی یورپ گئے تھے!

سب گھر والوں نے باری باری کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر دروازہ نہ کھلا۔ سب لوگ بہت پریشان تھے کہ آخر کیا بات ہے، اللہ خیر کرے! تشویش کے مارے سب کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں انہوں نے کوشش کر کے دروازہ توڑ دیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ صاحب زادے نے 'Full volume' پر ڈیک لگایا ہوا ہے اور آنکھیں بند کیے بے ہنگم میوزک پہ محوِ رقص ہے۔ پہلے تو وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتے رہے اور اس انتظار میں رہے کہ شاید وہ پاس کھڑے لوگوں کو دیکھ لے، کسی کا لحاظ کر جائے اور اپنی حالت پر قابو پائے۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو سب نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑا لیکن وہ اپنی دُھن میں لگا رہا۔

کسی نے اچانک میوزک بند کیا تب اُس نے آنکھیں کھولیں۔ والدین نے پوچھا بیٹا! یہ تم کیا کر رہے تھے؟ بجائے شرمندہ ہونے کے اُس نے اس مداخلت پر خفگی کا اظہار کیا اور بڑی بے باکی سے بولا، یہ نیا زمانہ ہے، یورپ میں ایسا ہی ہوتا ہے، آپ کو اس سے کیا!

بات یہ ہے کہ ہر قوم کی پہچان الگ ہے جس طرح ہر درخت، ہر پھول اور ہر خطۂ زمین دوسرے سے مختلف ہے۔ اور ہر شے کی بقاء اور سلامتی اس میں ہے کہ اُس کی اپنی پہچان باقی رہے۔ مگر شاید ہم اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں دوسری اقوام کی تہذیب و ثقافت کی بہت پزیرائی ہے۔ خاص طور پر نوجواں نسل تو کچھ زیادہ ہی

Marfat.com

تہذیب غیر سے متاثر نظر آنے لگی ہے۔

مجھے اپنے نوجوان مسلم سے صرف یہ کہنا ہے کہ ہماری تاریخ بہت شاندار اور قابلِ فخر روایات کی امین ہے۔ اس میں بہت سی شخصیات کے کارہائے نمایاں رقم ہیں جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اُنہیں میں سے ایک اہم حوالہ وہ بھی ہے جسے ہم اقبال کہتے ہیں۔ پوری قوم کو اُن سے محبت کا دعویٰ ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اقبال بھی یورپ گئے تھے۔ کئی سال وہاں رہے۔ وہاں کی محفلوں میں اُٹھے بیٹھے، مغربی تعلیم حاصل کی، یورپی تہذیب کے اندر رہے، وہاں کی ہر ہر چیز کو 'observe' کیا۔ اُس وقت وہ بھی نوجوان مسلم تھے۔ اُن کے بھی جذبات تھے، اُن کے گردوپیش میں بھی تہذیب حاضر کی رنگینیاں تھیں۔ مگر یہ سب کچھ اُن کے عزم جواں کو متزلزل نہ کر سکا۔ بلکہ اُس طوفان بلا میں اُن کی شخصیت کو اور بھی نکھار ملا، اس لیے کہ اقبال کو اپنی تہذیب اور شناخت پہ ناز تھا۔ انہوں نے مغرب کا اصل چہرہ بے نقاب کیا، اُس کی خرابیوں کی نشاندہی کی اور مسلمان کو سمجھایا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِؐ ہاشمی

اقبال تو نوجوان مسلم کو شاہین کی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ اُنہیں اِس سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ وہ تو اسے بہت اُونچا اُڑتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور اس اُڑان میں حائل ہر روکاوٹ اور بالخصوص تہذیب مغرب پر ضربِ کاری لگاتے ہوئے کہتے ہیں:

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے پیچ و خم
رُوح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی

ہم ہر سال بڑی دھوم سے ''یوم اقبال'' مناتے ہیں، ''فکرِ اقبال'' کے حوالے دیتے ہیں اور اُن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم حکیم الامت کے حکیمانہ پیغام سے عملی استفادہ بھی کریں اور یاد رکھیں کہ اقبال کو فخر تھا کہ:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!

□□□

Marfat.com

مؤدبانہ گزارش ہے!

جمعے کا دِن تھا۔ بے چارے مریض آدمی نے بڑے اہتمام سے وضو کیا اور گھر پر ہی نماز ادا کرنے لگا۔ ابھی اُس نے نماز شروع کی ہی تھی کہ گردونواح کی تمام چھوٹی بڑی مساجد میں تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چاروں طرف سے آنے والی لاؤڈ سپیکرز کی آوازیں اس قدر تیز اور شدید تھیں کہ اُس کے لیے نماز ادا کرنا انتہائی دُشوار ہو گیا۔ توجہ ایسی ہٹی کہ دورانِ نماز بار بار بھولتا اور پریشان ہوتا رہا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ عبادت گزاری کے لیے جہاں انسان کا ذاتی اِنہماک اور خشوع و خضوع انتہائی ضروری ہے وہاں یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ آس پاس کے لوگ اپنی کسی بھی حرکت سے کسی عبادت کرنے والے کو پریشان نہ کریں۔ لیکن ہمارے ہاں تو صورتِ حال ہی عجیب ہے! کسی کو دوسرے کا احساس ہی نہیں۔ خواہ کوئی بیمار ہو، کوئی پڑھائی میں مصروف ہو یا کوئی عبادت کر رہا ہو، اُس کے بارے میں کسی ضابطۂ اخلاق کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ ویسے تو اِس کے کئی پہلو ہیں تاہم ہماری مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر کا بے دریغ استعمال خاص طور پر توجہ طلب مسئلہ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی چیز بذاتِ خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اُس کے مفید یا مضر ہونے کا انحصار اُس کے استعمال پر ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ لاؤڈ سپیکر دورِ حاضر کی ایک سائنسی ایجاد ہے تاکہ آواز کو دُور تک پہنچایا جا سکے۔ لیکن اس کے لیے کچھ حدود و قیود کی پابندی بہت

Marfat.com

ضروری ہے تاکہ یہ ایجاد دوسروں کے لیے وبالِ جان نہ بنے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر اسلامی معاشرے میں سپیکر کے استعمال کا جواز اذان، کسی اہم اعلان یا مساجد کے اندر لوگوں کے بڑے بڑے اجتماعات کی صورت میں یکساں آواز پہنچانے کے لیے ہے۔ مثلاً جمعے یا عیدین کے اجتماعات وغیرہ۔

موقع جمعے کا ہو یا عیدین کا یا کسی اور مذہبی تہوار کا ہماری مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر آناً فاناً کھل جاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، بس! آوازوں سے آوازیں ٹکراتی ہیں۔ مسجدوں کے اندر بیٹھے لوگوں کو تو شاید اِس کا کوئی خاص احساس نہ ہو البتہ سپیکر بازی کا اندازہ باہر سے خوب ہوتا ہے۔

جوشِ خطابت میں یہ بات غالباً بھلا دی جاتی ہے کہ گھروں میں بیمار اور معذور لوگ بھی ہیں، خواتین بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ آخر کہاں جائیں؟ کیا اِن کا کوئی استحقاق نہیں؟ کہ وہ سکون سے عبادت کر سکیں۔ ہمارا دین تو سراسر بھلائی، خیر خواہی اور احساس کا دِین ہے جس میں حقوق العباد کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اگر مذہب کو جاننے کا دعویٰ کرنے والے ہی اِس طرف توجہ نہ دیں تو اس کی توقع اور کس سے کی جائے!

مؤدبانہ گزارش ہے کہ مساجد میں خطبۂ جمعہ وغیرہ کے لیے بیرونی لاؤڈ سپیکروں کے اِستعمال سے گریز کیا جائے جو آس پاس کے گھروں میں موجود افراد کے لیے تکلیف اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کسی کے نزدیک مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال بہت بڑی نیکی ہو، مگر بات یہ ہے کہ اسلام میں ایسی کسی نیکی کا کوئی تصور نہیں جس سے عوام الناس کو تکلیف پہنچے۔ ہمارے لیے تو بہترین عملی رہنمائی اور روشنی پیغمبرِ اسلام ﷺ کے اُسوۂ حسنہ میں ہے۔ حضور محسنِ انسانیت ﷺ نے لمبی نماز پڑھانے سے صرف اس لیے منع فرمایا تھا کہ کمزوروں اور معذوروں کو تکلیف نہ ہو۔ چہ جائیکہ مسجد کے پلیٹ فارم پر سپیکر کے ذریعے لوگوں کو پریشان کیا جائے۔ مسلمان کی تعریف تو یہ ہے کہ اُس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔

□□□

Marfat.com

اسلامی زندگی کا جزوِلاینفک

صداقت بیانی یا حق گوئی ایک روّیے کا نام ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اِنسان کے اچھا یا بُرا ہونے کی پہچان اُس کے اچھے یا بُرے روّیوں سے ہوتی ہے۔ سچائی اِنسانی کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ سچائی کا لازمی تقاضا ہے کہ کسی بھی بات، کسی بھی چیز، کسی بھی نظریے اور عقیدے کی حقیقت اور اصلیت معلوم کی جائے اور پھر غیر جانب دارانہ طور پر جو کچھ معلوم ہوا ُسے من وعن تسلیم کرلیا جائے، سچ بولنے والوں کا ساتھ دیا جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ قرآن کہتا ہے: ''کونوا مع الصّٰدِقین''یعنی سچ بولنے والوں کا ساتھ دیا کرو۔

دیکھا جائے تو انسان کا اصل مقام واحترام سچ ہی کا مرہونِ منت ہے جب کوئی جھوٹ بولتا ہے یعنی حقیقت کو چھپاتا ہے تو اُس کا ضمیر بھی اُسے ملامت کرتا ہے اور وہ لوگوں کی نظروں سے بھی گرجاتا ہے۔ اِس منفی روّیے کی بدولت وہ معاشرے میں اپنا وقار اور اعتبار کھو دیتا ہے اور بالآخر اُس کی حیثیت خزاں رسیدہ پتے کی سی ہو کے رہ جاتی ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنتا ہے۔ کوئی بھی دل سے اُس کی عزت وتوقیر نہیں کرتا۔

یہ اتنی اہم بات ہے جسے کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اچھے شخص کی اوّل وآخر پہچان سچائی ہے۔ تمام تر حسن وخوبی صرف حق وصداقت میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچ بولنا اسلامی زندگی کا جزولاینفک قرار پاتا ہے۔ حضور سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا

Marfat.com

کہ کیا مسلمان کنجوس ہوسکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ زبان اقدس سے ارشاد ہوا کہ ہرگز نہیں۔

اسلام کی رُو سے یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص دعویٰ ایمان واسلام بھی کرے لیکن اُس کے عملی رویّے میں سچائی نہ ہو، اس لیے کہ اسلام بذات خود سب سے سچا دین، یعنی دینِ فطرت ہے۔ یہ سب سے پہلے سب سے بڑی صداقت یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات لازوال کا تعارف کراتا ہے اور اِنسان کو چیلنج کرتا ہے کہ ''وَمَن اصدق مِن اللّٰه حدیثاً'' یعنی بتاؤ تو سہی کہ اللہ کی بات سے زیادہ سچی بات اور کس کی ہوسکتی ہے؟

پھر دیکھئے کہ اللہ کے دین کے حوالے سے جن شخصیات کا بطور انبیاء ورسلؑ انتخاب ہوا، اُن کی صداقت ضرب المثل تھی اور جس ذات پر اللہ نے اپنے دین کی تکمیل فرمائی وہ اَصدق الناس ذات ہے، جس کی صداقت وامانت ایسی مسلمہ، ایسی شفاف کہ دشمن بھی اُسے ''الصادق والامین'' کہیں۔ اور پھر اصدق الناس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو صحیفۂ ہدایت نازل کیا گیا اُس کی صداقت کا یہ عالم کہ اوّل وآخر صفت ''لاریب'' سے متصف، جو دِین اپنے ہر ہر پہلو میں، ہر لحاظ اور ہر انداز سے مبنی برحق وصداقت ہو، وہ کیوں نہ اپنے پیروکاروں سے ہر حال میں سچ کا دامن تھامنے کا تقاضا کرے!

سچائی کی بدولت ہی معاشرہ حسن معاشرت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ ایسی خوبی ہے جس کے باعث بہت سی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ذرا اُس شخص کی مثال سامنے رکھیے جو اس حال میں بارگاہ نبوت ورسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا کہ بڑے بڑے جرائم اور گناہوں کا عادی تھا۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے صرف سچ بولنے کا عہد لیا تو رفتہ رفتہ اُس کی گناہوں کی عادت جاتی رہی۔

آج بھی اگر ہم معاشرے کو جرائم کی آلودگی سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر معاملے میں سچائی اور صاف گوئی کا رویّہ اپنانا ہوگا۔ یہ عہد کرنا ہوگا کہ صرف سچ بولنا ہے، سچ بولنے والوں کا ساتھ دینا ہے۔ ہر سچائی کو تسلیم کرنا ہے۔

□□□

Marfat.com

جیسا کرنا ویسا بھرنا

دو باتوں کے سبب لوگوں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ اِنسان یا اچھا ہوتا ہے یا برا۔ اچھا انسان اپنے لیے، ملک و قوم کے لیے بلکہ پوری نسلِ انسانی کے لیے خوشی، خوش حالی اور تعمیر و ترقی کا پیغام لاتا ہے۔ اس کے قول و فعل سے دوسروں کو فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ وہ اِنسان کو اِنسانیت کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اُس کا دِل اِنسانیت کے لیے تڑپتا ہے۔

جب کہ بُرا شخص ہر کسی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اُس کے وجود سے نسلِ اِنسانی کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ وہ تخریب کاری کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اُس کے سینے میں گویا پتھر کا دل ہوتا ہے جو دُکھی اِنسانیت کے لیے بجائے تڑپنے کے اور بھی سخت ہو جاتا ہے۔ اُس کی آنکھوں پر خود غرضی، ہٹ دھرمی اور اِنسان دشمنی کی پٹی بندھی رہتی ہے کہ وہ ہر وقت مرنے مارنے کی بات کرتا ہے، دوسروں کے حقوق غصب کرتا چلا جاتا ہے، اور دوسروں کو اپنا محکوم اور غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکاتا ہے یہ سوچے بغیر کہ وہ خود بھی اُس آگ کی لپیٹ میں آ سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ خود ہی نا قابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہو جائے۔

یہی دو باتیں یعنی اچھائی اور بُرائی اِنسانی کردار کی طرح اُس کے انجام میں بھی کارفرما ہوتی ہیں یعنی اِنسان اچھے یا بُرے انجام سے ہمکنار ہوتا ہے۔ انجام یا بدلہ اصل میں اِنسان کے کردار و عمل کے ردِّ عمل کا نام ہے، جو طے شدہ اصول اور ضابطے پر مبنی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ

Marfat.com

گیند کو جس قدر قوت سے دیوار پر مارا جائے وہ اُسی قوت سے واپس بھی آتی ہے۔ جس فصل یا درخت کا بیج بویا جائے ہمیشہ وہی کچھ اُگتا ہے۔ ایسی سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں ہیں جو ہم اس بات کی تفہیم کے لیے سامنے رکھ سکتے ہیں کہ ہر عمل کا ردِعمل قطعی اور اٹل ہے۔ اچھے کا اچھا جبکہ برے کا بُرا انجام۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اُس کے ردعمل یا انجام سے فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ اچھا یا بُرا کام کرنا تو انسان کے بس میں ہے، لیکن انجام ایک فیصد بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔

انسان اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ اور حتمی انجام تو آخرت میں ہی دیکھے گا۔ ''مَن یَّعمل مِثقالَ ذَرَّہ خیراً یّرَہٗ وَمَن یَّعمل مثقالَ ذرّۃ شَرّاً یرَہ'' ذرہ بھر عمل بھی بغیر بدلے کے نہیں رہے گا۔ تاہم دنیوی زندگی میں بھی ہم بڑی حد تک اِس مسلمہ حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اچھے لوگوں کا ذکر ہمیشہ اچھے لفظوں کے ساتھ باقی رہتا ہے، ان کا نام ہمیشہ عقیدت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اُن کے اچھے کاموں سے فی زمانہ لوگوں نے استفادہ کیا، ان کا کردار و عمل اور کارہائے نمایاں صدقہ جاریہ کی صورت میں باقی رہے ہیں۔

اِسی طرح جو لوگ قدم قدم پر انسان دشمنی کا ثبوت دیتے رہے، ظلم و تشدد کا بازار گرم کرتے رہے، حق تلفی اور بربریت کے مظاہرے کرتے رہے اور معاشرے میں برائی کے 'Symbol' کے طور پر بھیانک سرگرمیوں میں مصروف رہے، نام اُن کا بھی لیا جاتا رہا مگر جذبۂ نفرت کے ساتھ، ذکر اُن کا بھی کیا جاتا ہے مگر ناپسندیدہ کردار کے حوالے کے طور پر، اُن کو جو لقب بھی دیا گیا وہ بھی اُن کے حسبِ حال! سچ ہے ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے'' قانونِ فطرت کی رُو سے جب اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو اچھے اور برے لوگ ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟ اُن کا انجام کیونکر ایک جیسا ہو سکتا ہے؟

بُرے لوگوں کے لیے نسل در نسل پایا جانے والا جذبۂ نفرت بھی دُنیا میں ان کے انجام کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے۔

□□□

Marfat.com

قدیم عربوں کے بارے میں ایک تاثر

جاہلی عرب معاشرے کے بارے میں ایک عام تاثر پایا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا کوئی رجحان نہیں تھا۔ لوگوں کی یادداشت بہت مضبوط تھی جس پر اُنہیں شعوری طور پر فخر تھا۔ وہ اس بناء پر بھی عرب کہلواتے تھے کہ حافظہ و فصاحت و بلوغت میں کوئی قوم اُن کے مقابلے کی نہ تھی۔ اِس زبردست صلاحیت اور خوبی کے باعث وہ لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے تھے۔ گویا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس معاملے میں کاغذ قلم وغیرہ کے محتاج ہوں۔ عام خیال اور تاثر تو یہی ہے لیکن تحقیقی نکتہ نظر مختلف ہے جو اس کی نفی کرتا ہے۔

تاریخ ارض القرآن کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ اس معاملے میں مسلمان مصنّفین نے احتیاط سے کام نہیں لیا اور تحقیق کو بنیاد نہیں بنایا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اہلِ یورپ اس سلسلے میں یونانی اور رُومی سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے تحریری بیانات اور عرب کے آثارِ قدیمہ اور نقوش و کتبات پیش کرتے ہیں جو زبانی روایات کے مقابلے میں یقیناً زیادہ مستند اور اہمیت کے حامل حوالہ جات ہیں۔ مذکورہ کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ اب تک کتبات میں جس قدر شہروں اور علاقوں کے نام ملے ہیں وہ تمام تر عرب جغرافیوں میں مذکور ہیں۔

اس مؤقف کی تائید فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے بھی کی ہے جن کی مشہور زمانہ کتاب ''تمدن عرب'' ہے۔ اُس میں اِس بات کی تردید کی گئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب

Marfat.com

وحشی یا نیم وحشی تھے۔ تمدن عرب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اکثر سیاّح عربستان کے بہت کم مقامات سے واقف ہیں اور اِس حوالے سے اُن کے پاس بہت کم معلومات ہیں۔ گویا قدیم عرب کے لوگوں میں لکھنے پڑھنے یا خط کتابت کے بارے میں جو منفی تاثر پایا جاتا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ صحیح معلومات کا فقدان ہے۔

ایک اور بڑا مضبوط اور مستند تاریخی حوالہ الفہرست نامی کتاب ہے جو ابن الندیم کی تالیف ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ابنِ خلکان کے مطابق عربی رسم الخط میں سب سے پہلے حضرت اسماعیلؑ نے لکھا۔ جبکہ کچھ دوسرے اہلِ علم کے نزدیک عربی رسم الخط مُرامرِ بن مُرہ نامی ایک شخص نے ایجاد کیا تھا جس کا تعلق انبار کے علاقے سے تھا۔ دونوں صورتوں میں واضح ہوتا ہے کہ قدیم عربوں میں خط کتابت اور خواندگی کا رجحان پایا جاتا تھا۔

اصمعی کے بیان کے مطابق قریش سے پوچھا گیا کہ تم نے لکھنا کہاں سے سیکھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ حیرہ سے اور اہلِ حیرہ سے پوچھا گیا کہ تم نے کہاں سے سیکھا؟ تو انہوں نے کہا کہ انبار سے۔ ابن الکلبی کی تحقیق یہ ہے کہ حیرہ سے کتابت کا علم حجاز تک منتقل کرنے والا حرب بن امیہ بن عبدالشمس بن عبدالمناف قریشی اموی تھا۔

الفہرست میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ قبیلہ بنی طے کے تین اشخاص نے جو انبار میں رہتے تھے، عربی خط ایجاد کیا۔ ان میں سے ایک شخص مُرامرِ بن مرہ نے حروف کی شکلیں ایجاد کیں۔ جبکہ اسلم بن سدرہ نے حروف کے وصل وفصل کا طریقہ نکالا اور عامر بن جدرہ نے نقطے اور حرکات ایجاد کئے۔ انبار سے یہ خط عربی حیرہ پہنچا جہاں سے قریش نے سیکھا۔

اسی کتاب میں لکھنے پڑھنے کے پس منظر میں ایک بھرپور تاریخی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے اور دنیا کے مختلف قدیم ممالک میں تحریر وکتابت کے رجحان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مٹی پر لکھا۔ اس کے ایک عرصہ بعد تحریر کو دیرپا رکھنے کی خاطر لوگوں نے تانبے اور پتھر پر لکھنا شروع کر دیا اور یہ طوفانِ نوحؑ سے بہت پہلے کی بات ہے۔ پھر لکڑی اور درختوں کے پتوں پر لکھا جاتا رہا۔ کسی تحریر کو دوام بخشنے کی غرض سے لوگ درخت کی اُس چھال پر بھی لکھا کرتے تھے جو کمان پر چڑھائی جاتی تھی۔ بعدازاں جب چمڑے کی دباغت اور رنگائی کا سلسلہ شروع ہوا تو چمڑے پر لکھا جانے لگا۔ اہل مصر مصری کاغذ پر لکھتے تھے جو بُردی لکڑی

Marfat.com

سے تیار کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو سب سے پہلے حضرت یوسفؑ بروئے کار لائے۔ اہلِ روم سفید ریشم اور نرم کھال پر اور جنگلی گدھے کے چمڑے پر لکھتے تھے۔ اہلِ فارس بھینس گائے اور بکری کی کھال پر کتابت کرتے تھے۔ اہلِ عرب اونٹ کے کندھوں کی ہڈیوں اور لخاف یعنی سفید پتھر کے ٹکڑوں اور کھجور کی چوڑی ٹہنیوں پر لکھتے تھے۔ اہلِ چین اُس چینی کاغذ پر لکھتے تھے جو خشک گھاس سے تیار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے لوگ کتابت کے لیے تانبہ، پتھر اور سفید ریشم استعمال میں لاتے تھے۔

علم و معرفت کا سب سے بڑا ماخذ و منبع قرآن حکیم ہے جو خاص عرب پس منظر میں نازل ہوا۔ اس کا نقطۂ آغاز اِقراء ہے۔ اور پھر قرآن میں علم اور ذرائع علم پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے تحریر و کتابت میں استعمال ہونے والی چیزوں کے نام لیے گئے ہیں۔ مثلاً قلم، مداد یعنی سیاہی، قرطاس یعنی کاغذ، رق یعنی چمڑا یا کھال، لوح یعنی کندھے کی چوڑی ہڈی بمعنی تختی، حریر یعنی ریشم یا ریشمی کپڑا۔ اِسی طرح حدیث میں ادیم اور قضیم یعنی چمڑا، لخاف یعنی باریک سفید پتھر، رقاع یعنی کپڑے وغیرہ کے ٹکڑے، کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم عرب کے لوگ اِن چیزوں سے واقف تھے اور اُن میں لکھنے پڑھنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

□□□

قدیم عربوں کے بارے میں عام تاثر
یہ ہے کہ وہ فنِ تحریر سے ناواقف تھے
مگر تحقیقی نکتۂ نظر سے اس کی نفی ہوتی ہے

Marfat.com

مثال کی ضرورت

فطرت کا تقاضا ہے کہ کام کرنے سے پہلے اس کی کوئی عمدہ مثال سامنے رکھی جائے۔ اِس کے بغیر خاطر خواہ کارکردگی نہیں دکھائی جا سکتی۔ یہ تو صرف خالق کائنات کی ذات ہے جو ''بدیع السمٰوٰت و الارض'' ہے۔ اسے کسی مثال یا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، جو چاہے جب چاہے معرض وجود میں لے آئے۔ اور وہ جو کچھ بھی ہو بے مثال ہو ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَانٍ'' مگر انسان مثالوں اور نمونوں کا محتاج ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسے مثال کی ضرورت ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش بغیر مثال کے ممکن نہیں۔ جدت طرازی اور کمالِ فن کے عمل کو بھی اس سے انکار نہیں۔ یہ بات باعث ننگ و عار نہیں کہ اچھی اور دیدہ زیب عمارت بنانے کے لیے اِنسان ایک سے بڑھ کر ایک نقشہ ملاحظہ کرے یا حسن کارکردگی کی جستجو میں کسی کی مثالی کارکردگی پر انحصار کرے، بلکہ یہ تو اس کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے، ورنہ وہ ہمیشہ سرگرداں رہے گا اور گو ہر مراد سے محروم!

کامیابی وکامرانی صرف دنیا کے حصول کا نام نہیں بلکہ جس طرح حیات وممات لازم و ملزوم ہیں، بالکل ایسے ہی دنیا وآخرت کا معاملہ ہے، اور ایسے ہی دنیا وآخرت کی کامیابی یا ناکامی کا۔ دنیا کی زندگی کو 'مزرعۃ الآخرۃ' قرار دینے کا مطلب بہت واضح ہے کہ انسان کی کامیاب آخرت کا دارومدار اُس کی عمدہ دنیوی کارکردگی پر ہے۔ لٰہذا ضروری ہے کہ دُنیا میں انسان کی

Marfat.com

کارگزاری بہتر اور حسن کارکردگی کی تصویر ہو۔ اس مقصد کے لیے اچھی اور عمدہ مثالوں کی ضرورت کسی تفصیلی تعارف کی محتاج نہیں۔

ربِ کائنات نے بنیادی طور پر انسان سے حقائق کو تسلیم کرنے اور اس کا عملی ثبوت فراہم کرنے کا تقاضا کیا ہے۔ اس سلسلے میں نسلِ انسانی کے لیے رُشد و ہدایت کا بطورِ خاص اہتمام کیا گیا، جسے نبوت ورسالت کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ حقائق کیا ہیں؟ سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ عمل کیا ہے؟ ایمان وعمل کے تقاضے کیا ہیں؟ فلاح ونجات کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟ اِن تمام تر سوالوں کا صحیح اور حقیقت پر مبنی جواب نبوت ورسالت کے عظیم تر سلسلے میں مضمر ہوا۔ اللہ نے انبیائے کرامؑ کو نسل انسانی کے ہر خاص وعام کے لیے مثال بنا کر پیش کیا اور ہر دور میں ہر نبی کی اُمت پر اُس کی اطاعت کو لازم کیا۔

''وما ارسلنا مِن رسولٍ اِلّا لیطاع باذن اللّٰہ''

اطاعت کسی مثال یا نمونے ہی کی ہو سکتی ہے۔ انبیائے کرامؑ اللہ کے ضابطۂ ہدایت کی من وعن تعمیل کے حوالے سے وہ اصل مثالیں ہیں جن کی پیروی کا حکم ہر دور میں دیا جاتا رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ فرمایا گیا کہ ان کی ذات میں دوسروں کے لیے اُسوۂ حسنہ یعنی عمدہ نمونہ ہے۔

انبیائے کرامؑ پے در پے مبعوث ہوتے رہے اور ہر دور کے انسان کو مطلوب فطرت فکری وعملی مثالیں دستیاب ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رشد وہدایت کا الہامی سلسلہ اپنے آخری اور تکمیلی مرحلے میں داخل ہو گیا۔ قیامت تک ہر دور کے انسان کے لیے ہدایت اور نجات کا آخری فیصلہ ہوا، بعثتِ محمدی ﷺ! جو نسل انسانی پر ربّ کائنات کا عظیم تر احسان ہے۔

''لقد من اللّٰہ علی المومنین اذ بَعث فیھم رسو لاً مِن انفسھم''

نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت گزشتہ تمام تر الہامی سلسلۂ ہدایت کا نچوڑ اور نقطۂ عروج ہے۔ اصولی طور پر ہر دورِ نبوت کی طرح حضور ختم الرسل ﷺ کی اطاعت بھی لازم قرار پائی۔ بعثت محمدی ﷺ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کے لیے ہے، اس ذاتِ اقدس کی بعثت کہ جو انسانِ کامل کی ذات ہے لہٰذا تقاضائے فطرت ہے کہ آنے والے ہر دور کے ہر خاص وعام کے لیے بہترین نمونۂ فکر وعمل یعنی اُسوۂ حسنہ یہی ہے۔

Marfat.com

شکر اور ایمان لازم وملزوم ہیں

اِنسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ربّ کائنات کی عطا اور نعمت ہے۔ اِنسان کی اپنی ذات سے لے کر تمام تر ظاہری و باطنی لوازماتِ حیات تک نعمت ہی نعمت اور احسان ہی احسان ہے۔ کائنات کو اِنسان کے لیے مسخر کر دیا گیا کہ وہ اس میں غور و فکر کرے اور اس سے فائدہ اُٹھائے۔ بقول اقبال رحمتہ اللہ علیہ:

؎ نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

کتنی بڑی بات ہے! یہ سب کچھ اِنسان کے مقام کے پیشِ نظر ہے کہ

ع ہر مقام سے آگے مقام ہے تیرا"

ہر مخلوق سے برتر مقام اِنسان کا ہے۔ اسی لیے ہر شے اس کے لیے مسخر کی گئی۔ اِسے بے حد و حساب اِنعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اِنسان کے اِس منفرد مقام ہی کے پیشِ نظر اس سے کچھ تقاضے بھی کیے گئے۔ جن میں سے ایک اہم بات شکرِ نعمت کے حوالے سے ہے۔ قانون فطرت کی رُو سے لازم ہے کہ اِنسان نعمتوں پر شکر ادا کرے۔

شکر سے مراد نعمت اور اِحسان کا ادراک، اِحساس اور اِعتراف ہے۔ یعنی سب سے پہلے اِنسان شعوری طور پر تسلیم کرے کہ اُسے جو میسّر ہے وہ نعمت ہے۔

Marfat.com

پھر یہ کہ نعمت کس کی عطا کردہ ہے؟ کیا اُس کی جو حیّ و قیوم، خالق حقیقی اور قادر مطلق ذات ہے یا اُس کی جو کہ مخلوق ہے! اس سوال کا جواب اپنے شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اِنسان نے خود تلاش کرنا ہے جو بالکل بھی مشکل نہیں۔ روزِ روشن کی طرح عیاں اور دوٹوک بات ہے کہ بنیادی طور پر مخلوق کو نعمت عطا کرنا صرف اور صرف خالقِ کائنات کے اِختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے اُس کو نواز دے، جتنا چاہے عطا کرے۔ سب کچھ اُسی کے دائرہ اختیار میں ہے جو لامحدود ہے۔ چنانچہ لازم ہے کہ یہ بات تسلیم کی جائے کہ منعم حقیقی اللہ ہی کی ذات ہے۔ جب زندگی ہی اُس کی دی ہوئی ہے تو لوازماتِ زندگی کیا کوئی اور دے گا! اگر کچھ لوازماتِ حیات کے حصول میں اِنسان کی صلاحیت، ہمت اور کوشش کا دخل ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ صلاحیت، ہمت اور کوشش کرنے کی طاقت کہاں سے آتی ہے!

شکر کا مطلب جان لینے اور یہ مان لینے کے بعد کہ تمام تر نعمتوں کا سرچشمہ یعنی منعمِ حقیقی رب کائنات کی رحمٰن و رحیم ذات ہے، ضروری ہے کہ اِنسان یہ بھی سمجھ لے کہ شکر کیوں ضروری ہے اور یہ کیسے ادا ہوگا!

بات یہ ہے کہ شکر انسان کے لیے صرف ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے اگر انسان مطلوب و مقصودِ فطرت بننا چاہتا ہے۔ دینِ فطرت میں شکر ایمان سے قریب تر ہے۔ یعنی جو شکر ادا کرتا ہے وہ گویا ایمانداری کا ثبوت دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شکر نعمت کا مفہوم سمجھتے ہوئے اللہ کے حضور شکر ادا کرتا ہے یعنی وہ اللہ کی ذات کو تسلیم کر لیتا ہے اور اُس پر ایمان لے آتا ہے۔ جبکہ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو گویا کفر کرتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ''واشکرولی و لا تکفرون'' تم میرا شکر ادا کرو اور کفر مت کرو۔ معلوم ہوا کہ شکر ایمان سے وابستہ ہے۔ جو اللہ کو مانتا ہی نہیں وہ اُس کا شکر کیا ادا کرے گا!

شکر نعمت کا اوّل و آخر تقاضا یہ ہے کہ انسان جس کی نعمتوں سے استفادہ کر رہا ہے، لطف اندوز ہو رہا ہے، اُسے ہر لمحہ یاد بھی رکھے، اُس کی ہر ہر بات بھی مانے اور اُس کے قانون کی حکمرانی میں زندگی گزارے۔ یہی اوّل و آخر انسان کے حق میں بہتر ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو اُس پر انعام و اکرام کی مزید بارش ہوگی اور وہ خوشی، خوش حالی اور خوش بختی سے ہم کنار ہوگا۔ بصورتِ دیگر نعمت چھن بھی سکتی ہے، عذاب آ بھی سکتا ہے! وضاحت ہے ''لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ

Marfat.com

لَئِن كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِی لَشَدِیْد ''شکرادا کرو گے تو اور نوازوں گا، اگر کفر کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

شکرِ نعمت کو تحدیثِ نعمت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی نعمت کے حوالے سے تقاضے پورے کرنا اور نمود و نمائش کی بجائے اللہ کی خوشنودی کی خاطر اُس نعمت کا اظہار کرنا۔ قرآن کہتا ہے ''وَاَمَّا بِنعْمَت رَبّكَ فَحدّث ''یعنی اپنے پروردگار کی نعمت پر اُس کا شکرادا کرو، نعمت کا اظہار کرو۔ حضور سیّدِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اِظہار دیکھے۔

□□□

Marfat.com

فطری معیارِ فضیلت

دینِ فطرت کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے۔ بہت محترم اور معزز مخلوق ہے۔ جسے مسجود ملائکہ اور خلیفۃ اللہ فی الارض کا مقام حاصل ہوا۔ احسنِ تقویم پر بھی انسان ہی کو پیدا کیا گیا۔ گویا پوری کائنات میں جو مقام و مرتبہ انسان کا ہے وہ کسی اور مخلوق کا نہیں۔

ایک شعوری اور اعلیٰ و ارفع مخلوق ہونے کے ناتے انسان کے باقاعدہ حقوق و فرائض ہیں۔ تقاضا کیا گیا ہے کہ ہر شخص اپنا فرض پہچانے اور ادا کرے اور کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ اِسی کو حقوق و فرائض کا توازن کہا جاتا ہے، جس پر معاشرے کی سالمیت اور فلاح و بقاء کا انحصار ہے۔

خواہ کوئی مرد ہو یا عورت، وہ بہر حال انسان ہے اور اِس سے اُس کے انسانی مقام میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی حقوق و فرائض میں کوئی فرق آتا ہے۔ عورت اور مرد کی تخصیص کا مطلب تو صرف اُن کے الگ الگ دائرۂ کار کا تعین کرنا ہے۔ ضروری ہے کہ ہر کوئی اپنی حد میں رہ کر اپنا کردار ادا کرے۔ فضیلت و فوقیت کا اوّل و آخر معیار تو تقویٰ ہے، صرف تقویٰ!

فرمایا گیا کہ لوگو! ہم نے تمہیں زوجین یعنی ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز و محترم وہ ہے جو تقویٰ سے آراستہ ہے۔

Marfat.com

انسان کا تقویٰ سے آراستہ ہونا بے حد ضروری ہے، کیونکہ اس سے راستے کا تعین ہوتا ہے۔ تقویٰ کی بدولت انسان خیر و شر میں تمیز کرتا ہے اور فلاح کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اُس کی زندگی میں ایک مثبت اور تعمیری انقلاب برپا ہوتا ہے۔

تقویٰ ایک زبردست قوتِ محرکہ ہے۔ ایک باطنی کیفیت جو انسان کو نیکی پر اُبھارتی ہے اور بُرائی سے دُور کرتی ہے۔ قرآن میں تقویٰ ہی کو بہترین زادِراہ قرار دیا گیا ہے" وتزوّدُوا فانّ خیرا لزّادالتقوٰی" گویا تقویٰ انسانی اوصاف کی بنیاد ہے جس پر اچھے کردار کی عمارت اُستوار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر انسان کے کردار و عمل میں کوئی بھی اچھی اور قابلِ ستائش صفت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے دینِ فطرت کی تعلیم اور ہدایت کا بنیادی مقصد انسان میں صفتِ تقویٰ کو اجاگر کرنا ہے۔

تقویٰ کو دوسرے لفظوں میں خوفِ خدا کہا جاتا ہے۔ اُس ذات کا خوف جو خالقِ کائنات ہے، سب سے بڑی ذات ہے۔ اُس کی بے مثال عظمت شان کا احساس ہی اصل میں تقویٰ ہے۔ اسی کے تحت بندگی کا احساس اُبھرتا ہے، انسان کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اُس کی ظاہری و باطنی زندگی میں پاکیزگی آتی ہے۔ انسان دوستی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، انسان اللہ کے قانون کی حکمرانی میں آجاتا ہے اور زندگی منظّم اور مربوط ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ تقویٰ اور دانائی کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ حضور سیّدِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حکمت و دانائی کی بنیاد اللہ کا خوف یعنی تقویٰ ہے۔ علم و دانش، رشد و ہدایت اور حکمت و دانائی کا ماخذ و منبع چونکہ اللہ کی ذات ہے لہٰذا یہ فطری سی بات ہے کہ یہ باتیں، یہ صفات اُسے ہی میسر آئیں گی جو تقویٰ سے آراستہ ہوگا۔ کوئی کس قدر دانا اور دانشور ہے! اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے دل میں کس قدر تقویٰ ہے! گویا اصل روشنی یہی ہے، اسی سے انسان کے قلب و نظر روشن ہوتے ہیں، اُس کی فکر کو تازگی ملتی ہے اور وہ وسیع تر مقصدِ زندگی سے قریب تر ہو کر اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

□□□

Marfat.com

عبادت اور مذہب کا دائرۂ کار

عبادت کے لفظ سے یوں تو ہم سب واقف ہیں مگر اِس کے مفہوم کے ساتھ عام طور پر انصاف نہیں کیا جاتا اور عبادت سے صرف اذکار و وظائف اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ مراد لے کر اس لفظ کے معنی و مفہوم اور تقاضوں کو محدود کر دیا جاتا ہے۔

دینِ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع، جامع اور ہمہ گیر ہے جو پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ قرآنی تصورِ دین کے مطابق عبادت سے مراد اللہ کے حکم کی تعمیل ہے۔ وہ حکم نہ صرف نماز روزے سے متعلق ہے بلکہ کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ یوں عبادت کا لازمی تقاضا یہ قرار پاتا ہے کہ تمام تر احکام و قوانینِ اسلام انسانی زندگی میں نافذالعمل ہو جائیں۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ:

”یٰایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوٰت الشیطٰن انہ لکم عدوٌ مبین“

(ایمان والو! دائرہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کیا کرو۔ بے شک وہ تو تمھارا کھلم کھلا دشمن ہے۔)

قرآنِ حکیم ہمارے سامنے جس دین کا تصور پیش کرتا ہے اُس کی رو سے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری نشست و برخاست، خورونوش، رفتار و گفتار، رشتہ و قرابت، ازدواجی زندگی،

Marfat.com

انفرادی و اجتماعی زندگی، معیشت و ثقافت، حکومت و سیاست، تعلیم و تربیت، غرض پوری معاشرت عملاً اسلام کے مطابق ڈھل جائے، تب کہیں جا کر عبادت کا مفہوم ادا ہوگا۔

عبادت اور بندگی انسان پر لازم ہے کہ یہی بنیادی اور اصل مقصدِ حیات ہے۔

"وما خلقت الجن والانس الالیعبدون"

ایک بڑی غلط فہمی جس کی وجہ سے مسلمان کی زندگی میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور ہمارے اصل بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ دین کو زندگی کا کوئی ایک شعبہ یا پہلو سمجھ لیا گیا ہے۔ چنانچہ معاشی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی یا تعلیمی شعبہ ہائے زندگی کی طرح دین کو مذہبی پہلو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے جملہ پہلوؤں کے لیے دین سے راہنمائی حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور مذہب صوم وصلوٰۃ اور چند رسوم تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ نتیجتاً زندگی کا شیرازہ مربوط ہونے کی بجائے منتشر ہو جاتا ہے۔

اسلامی نکتۂ نظر سے "دین" حیاتِ انسانی کا کوئی ایک شعبہ نہیں بلکہ ضابطۂ حیات ہے جو تمام تر شعبہ ہائے حیات کو کنٹرول کرتا ہے۔ "ادخلوا فی السلم کافة" کا حکم اسی بات کی وضاحت کر رہا ہے۔ دینِ اسلام کے مکمل ضابطۂ زندگی اور کامل و اکمل نظامِ فکر و عمل ہونے کا بھی یہی مطلب ہے۔ منتشر اجزائے ہستی کی شیرازہ بندی اسی بات کو سمجھنے میں ہے اور بحیثیت مسلم زندہ رہنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اسلام ہی اللہ کا دین ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی مذہب اللہ کو قابلِ قبول نہیں۔ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ:

"ومن یبتغ غیرالاسلام دیناًفلن یقبل منهُ وهوفی الآخرةمن الخٰسرین"

مطلب یہ کہ دینِ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس لیے کہ دیگر مختلف ادیان و مذاہبِ عالم میں سے کوئی بھی "دین" کے صحیح مفہوم پر پورا نہیں اترتا۔ ایسا دین صرف اسلام ہے۔

"هوالذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهرهٗ علی الدین کلهٖ وکفٰی بالله شهیدًا"

(اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول ﷺ آخرالزماں کو مکمل ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ اس دین (دین اسلام) کو باقی تمام تر ادیان و مذاہب پر

Marfat.com

غالب کردے اور اس پر اللہ بطور گواہ کافی ہے۔)

قرآن کے پیش کردہ تصورِ دین کے مطابق دین اسلام قرآن اور حاملِ قرآن حضور سید کونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر مشتمل ہے۔ وہ ذات کہ جو قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عالمِ انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ بنایا اور اِس اُسوۂ کامل کی پیروی کو اہلِ ایمان پر لازم ٹھہرایا۔

□□□

ہمارے بگاڑ کی اصل وجہ یہ ہے کہ دین کو
زندگی کا ایک پہلو سمجھ لیا گیا ہے۔

Marfat.com

دوزخ اور جنت

دوزخ اور جنت برابر نہیں، اسی طرح اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت بھی برابر نہیں۔ دوزخ اور جنت اصل میں دو مختلف اور متضاد قسم کے حتمی انجام کی علامت ہیں، جن کا انحصار انسان کے فکر و عمل پر ہے۔ یہ اختیار بھی صرف ربِّ کائنات کا ہے کہ وہ مخلوق کو اُس کے منطقی انجام سے ہمکنار کرے۔ قیامت کے اِنعقاد اور آخرت کی زندگی کا بڑا مقصد بھی یہی ہے۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ برائی کا انجام سزا یا عذاب اور اچھائی کا ثواب کی شکل میں سامنے آئے۔

دوزخ سرکشی و نافرمانی کا انجام ہے، اللہ کی ناراضی اور گرفت کا نام جس کی شدت کا بیان ممکن نہیں۔ ''اِنّ بَطش ربّك لَشدید'' یعنی تمہارے رب کی گرفت بہت سخت ہے۔ انسان جب گناہ کرتا ہے تو اللہ اُس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ پے در پے گناہوں کا اِرتکاب اُس کی ناراضگی اور غضب میں شدت کا باعث بنتا ہے۔ لیکن اللہ کا طریقہ یہ نہیں رہا کہ وہ کسی کو فوراً پکڑ لے اور دوزخ میں ڈال دے، بلکہ سُنّۃُ اللہ ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ انسان کو ڈھیل دی گئی۔ گناہ گاروں کو خبردار کیا گیا، عذاب دوزخ سے ڈرایا گیا تاکہ وہ اپنے احوال پر نظر ثانی کر لیں اور عذاب سے بچنے کا سامان کریں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک سب کچھ تباہ برباد ہو چکا ہوتا۔

قرآنِ حکیم وضاحت کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے مظالم اور جرائم پر اُن کو فوراً پکڑ لیتا تو زمین پر کچھ باقی نہ رہتا، لیکن وہ ان کو ایک وقتِ مقررہ تک ڈھیل دیتا ہے۔ پھر جب پکڑتا ہے

Marfat.com

تو ایک بھی لمحہ آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔

جب کوئی گناہ کی زندگی سے باز نہیں آتا تو گویا وہ خود کو سزا کا حقدار ثابت کر دیتا ہے۔ پھر وہ لاکھ فرار چاہے اُسے کوئی راہِ فرار نہیں مل سکتی۔ قرآن میں خبردار کیا گیا ہے کہ دوزخ کی آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ آتش دوزخ جو نافرمان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

دوزخ انتہائی خوف اور بے بسی کی علامت ہے۔ اُس کے ہولناک مناظر کا تصور انسان کو لرزا کے رکھ دیتا ہے بشرطیکہ اُس کا ضمیر بیدار ہو اور وہ اس کی آواز سنے۔ بے بسی کا یہ عالم کہ مجرم ہر طرف سے عذاب کی لپیٹ میں رہے گا، باہر نہیں نکل پائے گا" وَالذین کفروا وکذّبوا بِایٰتِنا اُولٰئك اصحٰبُ النارھم فیھاخٰلدون" جنہوں نے نافرمانی کی اور اللہ کی کھلی نشانیوں کو جھٹلایا تو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہیں جو ہمیشہ اُس میں رہیں گے۔ دوزخ ایسا ٹھکانہ ہے جہاں نافرمان زندگی اور موت کے درمیان لٹکے رہیں گے۔

اس کے برعکس جنت فرماں برداری کا انعام ہے۔ اللہ کی رضاجوئی اور خوشنودی کا صلہ! ایسا صلہ جس کی عمدگی، خوبصورتی، دل کشی اور پائیداری کا بیان ممکن نہیں۔ جنت ایسے باغات کی علامت ہے جہاں ہر ہر نعمت بہترین شکل میں میسر ہو، ہر طرح کا راحت و آرام ہو۔ اور حسبِ خواہش ہر شے دستیاب ہو۔

قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ اُن کا رب صرف اللہ ہے پھر وہ اس بات پر ثابت قدم رہے یعنی انہوں نے آخر تک اللہ کے قانون کی حکمرانی میں زندگی گزاری، ان پر فرشتے اس پیغام کے ساتھ اُترتے ہیں کہ تم بے خوف ہو جاؤ اور غم نہ کرو اور اُن کو اُس جنت کے بارے میں خوش خبری دی جاتی ہے جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ان کی فرماں برداری کے سبب انہیں بشارت دی جاتی ہے کہ ہم یعنی اللہ اور اُس کے فرشتے دنیا اور آخرت میں اُن کے دوست ہیں۔ جنت میں اُن کے لیے وہ سب کچھ ہے جس کی وہ خواہش کریں گے۔

لفظِ جنت ایک زبردست آئیڈیل مقام کی عکاسی کرتا ہے، اُس کی جاذبیت اور سکون آفرینی کا یہ عالم کہ جو لوگ جنت میں جائیں گے وہ دنیا میں پیش آنے والے دکھ درد، مصائب اور کٹھن حالات کو یکسر بھول جائیں گے!

Marfat.com

نافرمانوں کو بھی جنت کا نظارہ کروایا جائے گا مگر دُور سے! اُن کو حسرت دلانے کے لیے، وہ کفِ افسوس ملیں گے، آرزو کریں گے، کاش کہ وہ فرماں بردار ہوتے! خواہش کریں گے کہ انہیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تا کہ وہ اسلامی زندگی اختیار کر کے جنت کما سکیں۔

قرآن کہتا ہے: ''لَایَسْتَوِی اصحٰبُ النّار واصحٰبُ الجنة اَصحٰبُ الجَنَّة ھُمُ الفائزون'' اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت برابر نہیں ہو سکتے، کامیاب وہی ہیں جو اہلِ جنت ہیں۔

□□□

Marfat.com

فطرت کی دعوتِ فکر

اسلام کو دینِ فطرت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ بھی خلاف فطرت نہیں۔ ہر تعلیم اور ہر حکم کا باقاعدہ فلسفہ ہے۔ ہر دعویٰ دلیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہر مدعی سے دلیل طلب کی جاتی ہے۔ ہر کسی کو اپنا مؤقف پیش کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یک طرفہ فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ خدائی کے دعویداروں اور مظاہرِ فطرت کے پجاریوں سے دلائل کی زبان میں بحث و مکالمہ کیا جاتا ہے کہ یہی اصول فطرت ہے۔ دن کی دلیل تو سورج کا وجود ہے۔ سیاہ بادلوں کی آڑ میں اس کی تردید ممکن نہیں۔

اِسلام مظاہرِ فطرت کے حوالے سے انسان کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ تمام تر سلسلۂ نبوت و رسالت اسی فکر کے دعوت و ابلاغ کی کڑیاں ہیں کہ نظام کائنات کا محور اور اصلِ وجودِ کائنات اللہ کی ذات ہے۔ مخلوق ہونے کے ناتے انسان پر اُسی کی عبادت و بندگی لازم آتی ہے، اس لیے کہ معبود کے لیے اوّل و آخر شرط قوتِ تخلیق کی صفت سے متصف ہونا ہے۔ یہ صفت اپنی پوری صحت کے ساتھ صرف اللہ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ وہی ہر شے کو عدم سے وجود بخشنے پر قادر ہے۔ اس سلسلے میں تمام تر ٹھوس دلائل کا واضح رُخ صرف اُسی ذات کی طرف ہے جو علیم و خبیر اور حیّ و قیوم ہے۔ ہر لحاظ سے بے مثال، با کمال اور لازوال ہے۔ ''لیس کمثله شیٔ''

اللہ کے علاوہ کسی کو معبود ٹھہرانا، اُس کی ذات، قدرت یا کسی صفت میں کسی کو شریک ٹھہرانا مسلمہ اصول فطرت کی واضح خلاف ورزی ہے۔ بڑی سیدھی سی بات ہے کہ جب کائنات کا

Marfat.com

خالق اور رب ایک ہے تو معبود ایک سے زیادہ کیونکر ہو سکتے ہیں!

جس طرح مختلف اِنسانی صلاحیتیں، اِستعدادیں اور کیفیتیں مستقل نہیں، اُن میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسانی فکر و شعور اور عقیدہ و ایمان میں بھی اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ عقیدہ و مذہب کے حوالے سے انکار و اقرار، ضعف و صحت ایمانی وغیرہ جیسی کیفیات انسان میں اسی لیے پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا انسان کو حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

قرآنِ حکیم نہ صرف کفر و شرک کی تردید و مذمت کرتا ہے بلکہ ایمان داروں کو مسلسل خبردار کرتا ہے کہ وہ ایمان لانے کے بعد بےفکر اور بے لگام نہ ہو جائیں۔ بلکہ اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہیں، اپنا محاسبہ کرتے رہیں تاکہ وہ آخر تک خالص ایمان کی حالت میں رہ سکیں۔ اسلام اس سوچ کی حمایت نہیں کرتا کہ انسان ایک دفعہ ایمان لے آئے، پھر جو چاہے کرے۔ جیسا کہ یہود کا مؤقف تھا کہ نافرمانی اور ہٹ دھرمی کے باوجود جنت صرف اُنہی کا حق ہے۔ قرآن اس مؤقف کی تردید کرتا ہے کہ اگر ایسا ہو، تو پھر تو ایک فرماں بردار اور ایک مجرم میں کوئی فرق نہ رہا۔

ایمان کا تقاضا تجدید ایمان بھی ہے، اس لیے خبردار کیا گیا کہ ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور قرآن سمیت تمام الہامی کتابوں پر ایمان لاؤ۔ تجدید ایمان یہ ہے کہ ایماندار شخص یعنی ایمان کا دعویٰ کرنے والا اپنی حالت کا جائزہ لیتا رہے اور اُن باتوں سے پرہیز کرے جن سے ایمان اور عقیدے پر منفی اثر پڑتا ہو۔ خلاف ایمان باتیں اور کام بالآخر ایمان سے محرومی کا باعث بن جاتے ہیں، اس لیے یہ بات بہت توجہ طلب ہے۔

اسلامی زندگی تو خالصِ ایمان اور عملِ صالح کے خوبصوت امتزاج کا نام ہے۔ یہ کوئی عارضی یا موسمی زندگی نہیں کہ کوئی جب چاہے ایمان لے آئے اور جب چاہے اس کے خلاف کرے۔ یہ تضاد کی کیفیت ہے جو سب سے زیادہ خطرناک رجحان ہے۔ قرآن مختلف اندازہائے خطاب کے ذریعے انسان کو خبردار کرتا ہے۔ کبھی یہ کہ "یاایھا الذین آمنوا آمنوا" اور کبھی یہ کہ "ولا تموتن اِلا وانتم مسلمون" تاکہ اُسے نظریۂ اسلام اور اسلامی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس رہے اور وہ خواہشِ نفس کا غلام بننے کی بجائے اللہ کے قانون کی حکمرانی میں زندگی گزارے۔

□□□

Marfat.com

اولاد کے قصور جذبۂ ممتا میں جذب ہو جاتے ہیں!

حیرت کا مقام ہے کہ جب اُس کا آخری وقت آیا، نزع کا عالم طاری ہوا تو دیکھنے والوں سے اُس کی حالت دیکھی نہ گئی۔ اُس کی تکلیف سے لوگوں کو سخت پریشانی ہوئی کہ ایسا متقی اور پرہیز گار شخص بھی یوں نشانِ عبرت بن سکتا ہے! ہر کوئی پریشان اور خوف زدہ کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا۔ حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے۔ صحابی کو کرب کی حالت میں دیکھا۔ دریافت فرمایا کہ اُس کا اپنی ماں کے ساتھ برتاؤ کیسا تھا؟ بتایا گیا کہ اچھا نہیں تھا، ماں ناراض ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اُس کی ماں کو بُلایا جائے۔ صحابی کی ماں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی۔ رحمتہ للعالمین ﷺ نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے بیٹے کو معاف کرتی ہے؟ اگر تم معاف کر دو تو تمہارے بیٹے پر جان کنی کا مرحلہ آسان ہو جائے۔ اُس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! اس نے مجھے بہت ستایا ہوا ہے۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتی۔ ماں کی بیٹے پر خفگی اور نفسیاتی کیفیت کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے اصحاب کرامؓ کو حکم دیا کہ لکڑیاں لاؤ اور آگ جلاؤ۔ ایک ماں نے یہ بات سنی تو چونک گئی! بولی آگ کس لیے! فرمایا تیرے بیٹے کو جلانے کے لیے، کیوں کہ آخرت کی آگ اِس آگ سے زیادہ سخت ہے۔ ماں کی ممتا جاگ اُٹھی، زبانِ حال سے پکار اُٹھی کہ نہیں، میرے بیٹے کو مت جلاؤ، میں اسے معاف کرتی ہوں۔

Marfat.com

چشم فلک نے یہ منظر دیکھا۔ کیسا رقت انگیز منظر ہوگا! ایک طرف قصور وار بیٹا اور دوسری طرف ماں کی ممتا! قدرت نے اس جذبے میں بھی کیسی وسعت اور فراخی رکھی ہے کہ اولاد کے سارے قصور اس جذبے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ماں کا معاف کرنا ہی تھا کہ قدرت بھی اس پر مہربان ہوگئی اور اُس کی روح پرواز کرگئی۔

انسان کی زندگی میں ماں کا مقام بہت بلند ہے۔ لیکن وہ اس طرف بہت کم توجہ دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کے ایک ایک مرحلے کی ترتیب وتشکیل پر غور کرے تو ہر ہر مرحلہ حیات ماں کی مہربانیوں اور شفقتوں کا منہ بولتا ثبوت نظر آئے گا۔ موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہوکر انسان کو جنم کون دیتا ہے؟ اس کی پرورش میں اپنا خون پسینہ کون ایک کرتا ہے؟ اسے سردی گرمی سے کون بچاتا ہے؟ کون ہے جو اس کے لیے راتوں کی نیند حرام کرتا ہے! اس کی تکلیف میں کون پریشان ہوتا ہے؟ وہ ذات ماں کی ذات ہے۔ جو انسان پر اللہ کا پہلا احسان ہے۔ وہ ذات ماں کی ذات ہے جو قصوروار اولاد پر بھی مہربان ہو جاتی ہے۔ اللہ نے اُسے اولاد کے لیے نرم دل بنایا ہے۔ وہ ذات ماں ہی کی ذات ہے جس کی عظمت کا تعین خود اللہ نے کر دیا اور اُسے یہ حق دیا کہ اُس کی عظمت کو سلام پیش کیا جائے۔ اس کی نافرمانی اور بے ادبی سے بچا جائے اور اُسے اُف تک نہ کہا جائے!

دینِ فطرت میں ماں کی نافرمانی کو حرام قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ وہ حکم دین کی رُوح کے خلاف نہ ہو، تاہم ایسی صورت میں بھی یہ لحاظ رکھنا ضروری ٹھہرایا گیا کہ بدتمیزی اور بے اَدبی نہ ہونے پائے۔ اسلام واحد دین ہے جس نے ماں کے مقام کو سب سے زیادہ اُجاگر کیا۔ جہاں اُسے اولاد کی تربیت کا ذمے دار قرار دیا وہاں اُس کی خدمت گزاری میں اولاد کی جنت رکھ دی۔

اسلام کی پیدا کردہ تہذیب کا بنیادی عنوان حسنِ عبادت ہے۔ حسنِ عبادت کا بنیادی تقاضا حسنِ اخلاق ہے۔ حُسنِ اَخلاق دوسروں کے حقوق کے تحفظ اور احترام کا متقاضی ہے۔ حقوق الناس یعنی اِنسانوں کے حقوق اور مقام کے سلسلے میں سب سے زیادہ فوقیت ماں کی ذات کو دی گئی ہے یہ فوقیت فطرت اور عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ محض مدر ڈے منانے کا تو کچھ مطلب نہیں!

□□□

Marfat.com

فاتح اَندلُس

دُنیا کے نامور سپہ سالاروں میں فاتح اَندلُس طارق بن زیاد بن عبداللہ کا نام کسی خاص تبصرہ وتعارف کا محتاج نہیں۔ طارق بن زیاد نے مختصر سی فوج کے ساتھ یورپ کی عظیم سلطنت سپین کو فتح کیا اور وہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ وہی مسلم سپین جس کی تاریخ صدیوں پر محیط رہی اور جس نے تاریخ یورپ میں نہایت اہم، ناقابلِ فراموش اور فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

طارق بن زیاد کی تعلیم وتربیت موسیٰ بن نُصیر کے زیرِ نگرانی ہوئی تھی جو خود فنون حرب کے ماہر اور نامور مسلم سپہ سالار تھے۔ طارق اصل میں موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انھوں نے بہت جلد فن سپہ گری میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی بہادری اور جنگی مہارت کا چرچا عام تھا۔

موسیٰ بن نُصیر افریقہ کے حکمران تھے۔ افریقہ کی اسلامی سلطنت کو اندلس کی بحری قوت سے خطرہ لاحق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی محرکات تھے جن کی بناء پر موسیٰ نے سپین کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے دشمن کی طاقت اور دفاعی حیثیت کا اندازہ لگانے اور کچھ دیگر متعلقہ معلومات حاصل کرنے کے لیے رمضان ۹۱ھ میں ۴۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ایک مہم وہاں بھیجی جس کی قیادت طریف بن مالک نے کی۔ وہ جس مقام پر اترے تھے، بعد میں اس کا نام بھی جزیرہ طریف مشہور ہوا۔ یہاں سے ایک اور جزیرہ خضراء کو بھی فتح کیا گیا۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو سات ہزار پر مشتمل فوج کے ساتھ سپین فتح کرنے کے لیے

Marfat.com

روانہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مہم کے دوران طارق بن زیاد نے ایک معاہدے کے تحت کاؤنٹ جولین کے بحری جہاز بھی استعمال کیے۔ اسلامی لشکر رجب ۹۲ھ کو ہسپانیہ کے ساحل پر اترا اور ایک پہاڑ کے قریب پڑاؤ کیا جو بعد میں جبل الطارق کہلایا۔

طارق بن زیاد نے ایسے مقام کا انتخاب کیا تھا جو عسکری حوالے سے اسلامی فوج کے لیے زیادہ موزوں اور محفوظ مقام تھا۔ وہاں پانی بھی میسر تھا اور سامان رسد کی دیگر سہولیات بھی۔ یہ مقام وادیٔ رباط کے کنارے پر تھا جسے وادیٔ بکر بھی کہا جاتا تھا۔ اُس مقام پر اسلامی فوج کے عقب میں لاجندا نامی جھیل تھی جسے البحیرہ بھی کہتے تھے۔ اِسی مقام پر طارق بن زیاد نے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے سامنے دشمن اور پیچھے سمندر ہے۔ اس سمندر سے مراد یہی البحیرہ تھا۔

اسی مہم کے دوران سمندر پار اُتر کر طارق بن زیاد نے اپنے جہاز جلا ڈالنے کا حکم دیا تھا تا کہ وہ اپنے اس عزم پر ثابت قدم رہ سکیں کہ اب ان کے لیے دو ہی راستے ہیں، موت یا فتح۔ اس غیر متزلزل ایمان اور جنگی قائدانہ حکمتِ عملی کی مثال بھی کم ہی ملے گی!

کہا جاتا ہے کہ باقاعدہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی گردونواح کے علاقوں کو اسلامی فوجی دستوں نے فتح کر لیا تھا۔ ان علاقوں کے گورنر نے سپین کے بادشاہ راڈرک کو اطلاع دی۔ راڈرک ایک بڑا مسلح لشکر لے کر مقابلے پر آیا اور دریائے رباط کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ اسی دوران موسیٰ بن نصیر کی بھیجی ہوئی پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل کمک طارق بن زیاد کی فوج کے ساتھ شامل ہو گئی۔ مسلسل آٹھ دن گھمسان کی جنگ ہوئی اور بالآخر دشمن کو شکست فاش ہو گئی۔ راڈرک نے جان بچانے کے لیے فرار کا راستہ اختیار کیا اور اپنے ہزاروں فوجیوں کے ساتھ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔

۹۳ھ میں سپین کے تمام بڑے شہر بشمول دارالحکومت مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو چکے تھے۔ مشہور مغربی مؤرخ فلپ کے حِتی نے لکھا ہے کہ طارق بن زیاد جس نے ۷۱۱ء کے موسمِ بہار میں مہم کی قیادت کا آغاز کیا تھا اِسی سال کے موسم گرما تک آدھے سپین کا مالک بن گیا۔

۹۴ھ میں طلیطلہ کے مقام پر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی اہم ملاقات ہوئی جس میں مفتوحہ علاقوں کے انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔ انہوں نے عربی اور لاطینی زبانوں میں نئے سکے

Marfat.com

بھی مضروب کرائے۔فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اچانک حکم نامہ بھیج کر دونوں کو دارالخلافہ میں طلب کرلیا۔

موسیٰ وطارق کے کارہائے نمایاں اسلامی تاریخ کا سرمایۂ افتخار ہیں۔وہ اپنی حُسنِ کارکردگی کی بدولت تاریخ میں اَمر ہوگئے مگر افسوس کہ اپنوں نے اُن کی قدر نہ کی اور یہ بھول گئے کہ یہ ہیروز تو ہماری تاریخ کے روشن ستارے ہیں۔

□□□

؎ دو نیم اِن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

Marfat.com

بچّے تو بچّے ہیں!

بچے گلی میں کھیل رہے تھے، بہت خوش وخرم، اپنی دنیا میں مگن، کسی حسد، لالچ اور مفاد سے بالاتر۔ کھیل ہی کھیل میں اچانک کسی بات پر اُن میں ناراضی ہوگئی اور وہ لڑ پڑے۔ بچے تو بہرحال بچے ہوتے ہیں، اُن کی آپس کی رنجشیں بھی کھیل کود کی طرح وقتی اور عارضی ہوتی ہیں۔ لڑتے جھگڑتے بھی ہیں اور پھر ویسے کے ویسے۔ مگر جب گلی میں بچوں کا شور اُٹھا تو اُن کے گھروں سے اُن کے بڑے باہر نکلے۔ بچوں نے اپنے اپنے بزرگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف شکائتیں شروع کردیں۔ بڑوں نے اپنے اپنے بچوں کے مؤقف کو درست قرار دیتے ہوئے آپس میں جھگڑنا شروع کردیا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے دو گھروں، دو ہمسایوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی دیوار حائل ہوگئی۔

معاشرتی زندگی کا اِستحکام باہمی اخوت ومحبت اور خلوص وایثار کا مرہونِ منت ہے۔ جب کہ نفرت، دشمنی اور تنگ نظری معاشرے کو نقصان پہنچانے والی بیماریاں ہیں۔ باہمی محبت کا فروغ ایک اچھی اور پُرسکون زندگی کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے انسان کو باحوصلہ اور وسیع الظرف ہونا پڑتا ہے، اور ہونا بھی چاہیے تاکہ اگر کبھی تلخ صورتِ حال پیش آ بھی جائے تو اُس پر اِس خوبصورتی سے قابو پایا جاسکے کہ نفرت کی بجائے جذبۂ الفت ومحبت غالب آئے۔

اصل میں اِسلام وہ واحد ضابطۂ زندگی ہے جس میں ہر وہ صفت اور خوبی پائی جاتی ہے

Marfat.com

جس سے انسان حسنِ کردار اور معاشرہ حسنِ معاشرت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ لڑائی جھگڑا خواہ بچوں کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے، کوئی قابلِ تعریف و تحسین بات نہیں ہے۔ اسلامی نظامِ فکر و عمل میں یہ توقع کی گئی ہے کہ بڑے اور بزرگ لوگ بہر کیف اپنے بڑا ہونے کا ثبوت فراہم کریں، دانش مندی کا مظاہرہ کریں اور بچوں جیسی حرکات سے کنارہ کش رہیں۔

بچے اگر بڑوں جیسا رویہ اپنا لیں جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی، تو اس میں کچھ زیادہ تعجب والی بات نہیں اس لیے کہ وہ تو اُنہی سے متاثر ہوتے ہیں، اُنہی کی نقل کرتے ہیں۔ البتہ بڑوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ اُن کا مقام کس اِحتیاط کا متقاضی ہے!

عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اور شرارتیں بڑے بڑے فسادات کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر ہم سمجھداری سے کام لیں اور دینِ فطرت کی روشنی میں سفر کریں تو ہم ایک بہت اچھا اور خوشگوار ماحول برپا کر سکتے ہیں۔ اولاد کی بہتر تعلیم و تربیت اور سیرت سازی کا تقاضا ہے کہ بچوں کے معاملات میں مثبت دلچسپی کا اظہار کیا جائے، اُن کے معاملات کو بخوبی نمٹا دیا جائے، اُن کے سامنے اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ اُن کے اندر بھی اچھے اوصاف پیدا ہو سکیں اور وہ معاشرے میں ایسے انسانوں کی حیثیت سے اُبھریں جو صلح و آشتی کے پیام بر، امن و محبت کے سفیر اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے علمبردار ہوں۔ اس لیے کہ یہ دین تو تمام افرادِ معاشرہ کے لیے صلح و سلامتی کا پیغام ہے اور اِس حوالے سے یہ تقاضا بھی کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو باہم لڑایا نہ جائے بلکہ لڑنے والوں کے درمیان اِصلاحِ احوال کی کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ نفرت و عداوت کے بل بوتے پر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے تو رواداری، اِتحاد اور محبت کی ضرورت ہے اور اِسی لیے تو اِسلام کا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

□□□

Marfat.com

بانئ پاکستان کا مطلوبہ پاکستان

سب جانتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کا اصل محرک ''دوقومی نظریہ'' تھا۔ یہ ملک کوئی حادثاتی طور پر معرضِ وجود میں نہیں آیا بلکہ اِس کا باقاعدہ پس منظر ہے جو نسل در نسل مسلم اور غیر مسلم فکری و تہذیبی کشمکش اور اُس کے نتیجے میں جنم لینے والی عملی جدوجہد سے عبارت ہے۔ تحریکِ پاکستان کے ہر مرحلے میں اِس نکتے کو امتیازی حیثیت اور بنیادی اہمیت حاصل رہی کہ قیامِ پاکستان کا مقصد اسلامی نظریۂ حیات کا نفاذ ہے تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کا تشخص محفوظ ہو سکے۔ یہی وہ عظیم مقصد تھا جس کے حصول کے بعد ہر اُس مقصد تک رسائی یقینی ہو جاتی ہے جو قومی ترقی، تہذیبی نشو و ارتقاء اور سیاسی و معاشرتی استحکام کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

یہ بات محض جذباتی اور معمولی نہیں تھی بلکہ بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی شفاف سیاسی زندگی کا نصب العین بھی تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی جس کا آئین اسلامی ہو گا۔ انہوں نے اس سلسلے میں مختلف مواقع پر بڑے واضح انداز میں اظہار کیا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ:

> ''اسلام ہمارا راہنما ہے اور ہماری زندگی کا مکمل ضابطہ ہے۔ ہمیں کسی سرخ یا پیلے پرچم کی ضرورت نہیں اور نہ سوشلزم، کمیونزم، نیشنلزم یا کسی اور ازم کی ضرورت ہے۔''

گویا بانئ پاکستان کی سوچ بہت واضح تھی کہ پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا؟ دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی اس عظیم ریاست کی بنیاد کیا ہوگی؟ اس کا نظم و نسق کس آئین کے مطابق چلایا جائے

Marfat.com

گا؟ اِس کی معیشت کن خطوط پر استوار ہوگی؟ اِس کی خارجہ پالیسی کی اساس کیا ہوگی؟ اِس کا نظامِ مالیات کس طرح مرتب کیا جائے گا؟ اور اِس کو درپیش مسائل کیسے حل کیے جائیں گے؟

قائداعظم نے یہ فرما کر کہ ''اسلام ہمارا راہنما ہے''۔ کسی بھی وقت، کسی بھی ذہن میں پیدا ہونے والے ابہام کو دور کر دیا کہ پاکستان کا اوّل و آخر دستور اسلامی ہوگا اور مملکت کے تمام شعبوں کو حضور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے اصولوں کے تحت چلایا جائے گا۔

اصل میں سیاست اور قانون کے طالب علم کی حیثیت سے محمد علی جناح نے دنیا کے تمام سیاسی نظاموں اور دساتیر کا جس طرح تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا تھا وہ ان کی انفرادیت بھی ہے۔ چنانچہ تقابلی جائزہ لیتے ہوئے وہ اِس نتیجے پر پہنچے تھے کہ نظامِ اسلام ہی بہترین راہنمائی کا حامل نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبے کے لیے مکمل اور بھرپور راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام ہی کا دیا ہوا نظامِ سیاست و حکومت ہر لحاظ سے بہترین ہے۔

کسی بھی قوم کی کارکردگی کا انحصار اُس کی قوتِ نافذہ پر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے کی اول و آخر پہچان یہ ہے کہ اس میں اللہ کے قانون کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اُسے نہ صرف تمام اختیارات کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ اُسے عملی طور پر نافذ بھی کیا جاتا ہے۔ اور جو کوئی بھی اسلام کے احکام و قوانین کے مطابق عوام الناس کی راہنمائی کرتا ہے اس کی اطاعت ہر خاص و عام پر لازم ہو جاتی ہے۔ اسلام کے تصورِ حکمرانی میں کسی فرد کی اجارہ داری نہیں ہوتی بلکہ تمام امور کی انجام دہی میں مشاورت کارفرما ہوتی ہے۔ بانیٔ پاکستان بھی اسی بات کے حامی تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ:

> ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ اطاعت اور وفا کیشی کا اصل مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے اور نہ کسی شخص یا ادارے کی، قرآنِ مجید کے احکام ہی سیاست اور معاشرے میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدیں قائم کرتے ہیں''

قائداعظم جس ملک کے حصول کے لیے اسلامیانِ ہند کی قیادت کر رہے تھے اُس میں وہ اسلامی نظامِ زندگی کا نفاذ چاہتے تھے۔ اِس کے لیے اگرچہ انہوں نے جمہوریت کا لفظ بھی استعمال کیا، لیکن جمہوریت سے ان کی مراد مغربی طرزِ حکومت و سیاست نہیں تھا جو حقوق کے نام پر

Marfat.com

انسانیت کی تذلیل وتحقیر کرتی ہے بلکہ اس سے ان کی مراد اسلامی نظامِ حکومت تھا جس کا اظہار انہوں نے کئی دفعہ کیا۔

کسی سرخ یا پیلے پرچم کو رد کرتے ہوئے اصل میں قائداعظم نے پرچم اسلام کے علاوہ دوسرے کسی بھی پرچم کی نفی کر دی اور اس بات کو اجاگر کیا کہ مسلمان اگر کسی پلیٹ فارم پر اور کسی پرچم تلے متحد ہو سکتے ہیں تو وہ صرف اسلامی پرچم اور پلیٹ فارم ہے۔

یومِ پاکستان اور یومِ قائد مناتے وقت جب تک یہ پیشِ نظر نہ ہو کہ بانیٔ پاکستان کا مطلوبہ پاکستان کیا تھا! وطنِ عزیز کے ساتھ وفاداری کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

□□□

Marfat.com

Marfat.com